ماہنامہ

قلندرِ شعور

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

اگست ۲۰۱۹ء

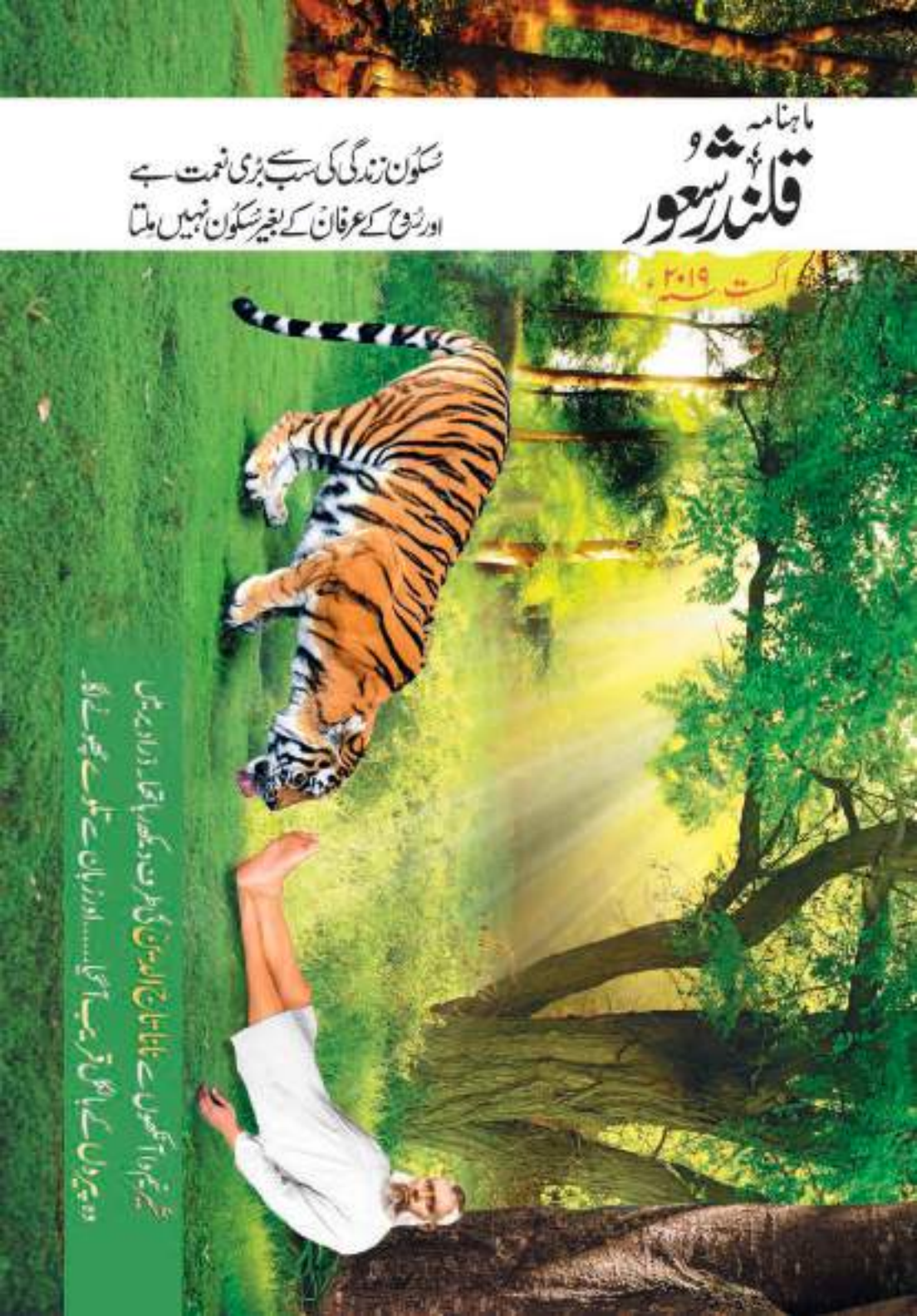

جلد 7 شمارہ 7 | اگست 2019ء | ذیقعد ـ ذوالحج 1440ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ـــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 70 روپے..... سالانہ ہدیہ 950 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 60 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 213 (0) 92+

۳۶ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ	شاہ انصار الہ آبادی	10
نعت رسول مقبول ﷺ	اقبال عظیم	11
رباعیات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ	12
آج کی بات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ	14
فقیر کی ڈاک	ادارہ	18
نامے میرے نام	خانوادہ سلسلہ عظیمیہ	20
دوتھال میں سارا ہے	سہیل احمد	25
پیرا سائیکالوجی ــ مسائل کا حل	خواجہ شمس الدین عظیمی	31
دل پذیر ــ پھول	منظور احمد	37
ن ق ط ہ ــ ؟	ادارہ	41
لبیک اللھم لبیک	حماد علی شاہ	47
الیکٹران کیا ہے ــ ؟	حامد ابراہیم (M.A-Fine Arts)	51
چلو ــ ناگپور چلیں	مہاراجا سر کشن پرشاد	57
غیب ــ حاضر ــ کہانی	عابد محمود	63
ڈائی مینشن	(آرکیٹیکٹ) عبدالوحید نظامی	67
مقداریں کیا ہیں ــ ؟	مہک رضا (M.A-Chemistry)	69
موئن جو دڑو	فضل حق قریشی	75

مئی 2019ء کے سرورق کی تشریح ______ قارئین 80

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ______ شوکت تھانوی 83

مرشد کی باتیں ______ (M.A-Mass Comm.) عائشہ خان 89

اقتباسات ______ قارئین 93

لکیروں میں مفہوم ______ گلِ نسرین 95

پورب کے ہم زاد ______ (M.Sc-Applied Physics) محمد عدنان خان 101

وعدہ پورا کریں ______ عبدالمجید 109

بھان متی ______ اشرف صبوحی 113

اللہ میاں کے باغ کے پھول ______

اولی الالباب بچے ______ ادارہ 119

اک میرا چاند اک میرا تارا ______ نفیسہ شاکر 121

مرغی نے خواب دیکھا ______ (M.A-Mass Comm.) سارہ خان 127

لڑکی نے گائے اٹھائی ______ حسن زمان 132

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ______ خواجہ شمس الدین عظیمی 135

147 Dr. Naeem Zafar (Ph.D.) ______ The Universe is Light

150 Extracted ______ Prophet Jesus (PBUH)

155 Bibi Anuradha (UAE) ______ The Enchanting Plant Kingdom

162 Sohail Ahmed ______ An Ocean of Knowledge

167 From the Desk ______ Dimensions in a Dot

172 K. S. Azeemi ______ Message of the Day

شاہ انصار الہ آبادی

حمد باری تعالیٰ

تیری ذات مظہر عدل کل، تیرا وصف عین کمال ہے
تیری حمد کیسے بیان کروں، مری زندگی کا سوال ہے

نظر اپنی جس کی طرف اٹھی، کسی جلوہ زار میں کھوگئی
تری شمع حسن کی ہر کرن، رخ مصطفیٰؐ کا مآل ہے

کبھی عقل و فہم سے ماورا، کبھی قلب و روح سے بھی قریب
تری بزم جلوہ نواز میں، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

جو کسی کا کوئی نہ ہوسکا، تو ترے کرم نے کرم کیا
مری معصیت کا طلسم بھی، تری رحمتوں کا کمال ہے

کوئی ذرّہ ہو ، کوئی شکل ہو، مہ و مہر ہوں کہ نجوم ہوں
جسے چشم قلب سے دیکھئے، وہ کمال سر جمال ہے

اسے زیب سجدۂ بندگی، اسے زیب عظمت دائمی
وہ کہیں نماز حسینؓ ہے، وہ کہیں اذان بلالؓ ہے

تیری ذات مظہر عدل کل، تیرا وصف عین کمال ہے
تیری حمد کیسے بیان کروں، مری زندگی کا سوال ہے

اقبالؔ عظیم

نعت رسول مقبول ﷺ

جہاں روضۂ پاک خیرالوریٰؐ ہے
وہ جنت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
کہاں میں کہاں وہ مدینہ کی گلیاں
یہ قسمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
محمدؐ کی عظمت کا کیا پوچھتے ہو
کہ وہ صاحبِ قاب قوسین ٹھہرے
بشر کی سرِ عرش مہماں نوازی
یہ عظمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
جو عاصی کو کملی میں اپنی چھپالے
جو دشمن کو بھی زخم کھا کے دعا دے
اسے اور کیا نام دے گا زمانہ
وہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
قیامت کا اک دن معین ہے لیکن
ہمارے لئے ہر نفَس ہے قیامت
مدینہ سے ہم جاں نثاروں کی دوری
قیامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
تم اقبالؔ یہ نعت کہہ تو رہے ہو
مگر یہ بھی سوچا کہ کیا کر رہے ہو
کہاں تم کہاں مدحِ ممدوح یزداں
یہ جرأت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

حرکت اور وجود

کھٹ پتلی ہے یہ نوع ہماری ساقی
حرکت ہے اشارات پہ ساری ساقی
ہوتی ہے جو تحریک تو پیتے ہیں ہم
ورنہ ہے بساط کیا ہماری ساقی

''بلاشبہ اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے — ہو اور وہ ہو جاتی ہے۔'' (یٰسٓ: ۸۲)

شے حرکت کے سبب وجود میں ہے۔ حرکت کی ابتدا تقاضے سے ہوتی ہے اور تقاضے میں تکرار ہے۔ ہر تقاضا پہلے سے ریکارڈ ہے اور پورا ہونے یا پورا نہ ہونے پر بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہ موجودگی زندگی کی بیلٹ پر واپس ہو جاتی ہے۔

تقاضا وہم سے شروع ہوتا ہے۔ وہم سے مراد ہے کہ تقاضے کا بہت لطیف احساس پرنٹ کی شکل میں موجود ہے۔ پرنٹ میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ گہرائی دراصل خیال ہے۔ خیال کی تعریف ذہن میں تقاضے کا ادراک ہونا ہے یعنی پانی پینے کے لئے تقاضے کا ظاہر ہونا، جس کو عرف عام میں ''پیاس'' کہتے ہیں۔

پیاس تقاضے کی حیثیت اختیار کر لے تو پانی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور مظاہرہ پانی پینا ہے۔ پانی پینے سے عارضی طور پر تشنگی دور ہوتی ہے لیکن پیاس کی تحریک نہ ہو تو ہم پانی نہیں پیتے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جو جاری و ساری ہے۔ آدمی کی بساط نہیں ہے کہ اس نظام کی کنہ سے واقف ہو جائے — الا ماشاءاللہ۔

زندگی دو رخوں پر قائم ہے — تقاضے کی تکمیل یا عدم تکمیل۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب تک ذہن کے پردوں میں حرکت نہ ہو اور حافظہ نہ دہرائے تو عمل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس قانون کے پیش نظر علم ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی یعنی گوشت پوست اور ہڈیوں سے مرکب جسم اطلاعات کے تابع ہے اور اطلاعات خیال کے تابع ہیں۔ خیال تصور بنتا ہے تو شے وجود میں آتی ہے اور خدمت پر مامور پانی خود کو پیش کر دیتا ہے۔

آج کی بات

یا بابا تاج الدین ولیؒ، تم زلفِ نبیؐ، گیسوئے علیؑ
تم لاڈلے بی بی زہراؓ کے، تم روئے حسینؑ، ابروئے علیؑ
پروردۂ نازِ خدا تم ہو، سرکردۂ رازِ خدا تم ہو
گل زارِ نیازِ خدا تم ہو، خوشبوئے حسنؑ خوشبوئے علیؑ
اس دور کے اندر جانا ہے، اس دور کے اندر سمجھا ہے
تم سے ہے جمالِ مصطفویؐ، تم سے ہے جلالِ خوئے علیؑ
تم ختمِ رسلؐ کا نقشِ قدم ، تم شمعِ عرب، تم شمعِ عجم
تم سرِّ خفی و جلی باہم، مہکی ہے تم سے بوئے علیؑ
یہ آپ ہی کا تو نواسہ ہے، دریا پی کر جو پیاسا ہے
جلووں کا سمندر دے دیجئے ، اے بادۂ حق اے جوئے علیؑ

ایک دن شہنشاہ ہفت اقلیم نانا تاج الدینؒ وا کی شریف کے جنگل میں پہاڑی ٹیلے پر چند لوگوں کے ہم راہ چڑھتے چلے گئے۔ نانا تاج الدینؒ مسکرا کر کہنے لگے،

''میاں جس کو شیر کا ڈر ہو وہ یہاں سے چلا جائے۔ میں تو یہاں ذرا سی دیر آرام کروں گا خیال ہے کہ شیر ضرور آئے گا۔ جتنی دیر قیام کرے اس کی مرضی، تم لوگ خواہ مخواہ انتظار میں مبتلا نہ رہو، جاؤ کھاؤ پیو اور مزہ کرو۔''

بعض لوگ ادھر ادھر چھپ گئے اور زیادہ چلے گئے۔

میں نے حیات خان سے کہا، کیا ارادہ ہے؟ پہلے تو حیات خان سوچتا رہا پھر زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سوال کیا، چلنا ہے یا تماشا دیکھنا ہے ــــ؟

بھلا بابا صاحب کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گا! حیات خان بولا۔

گرمی کا موسم تھا۔ درختوں کا سایہ اور ٹھنڈی ہوا خمار کے طوفان اٹھا رہی تھی۔

تھوڑی دور ہٹ کر میں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ چند قدم کے فاصلہ پر حیات خان اس طرح بیٹھ گیا کہ نانا تاج الدینؒ کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہے۔

اب وہ دبیز گھاس پر لیٹ چکے تھے، آنکھیں بند تھیں فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ جنگل بھیانک محسوس ہونے لگا۔ آدھ گھنٹا، پھر ایک گھنٹا۔ اس کے بعد کچھ وقفہ ایسے گزر گیا جیسے شدید انتظار ہو۔ یہ انتظار کسی سادھو، کسی جوگی، کسی ولی، کسی انسان کا نہیں تھا بلکہ ایک درندہ کا تھا جو کم از کم میرے ذہن میں قدم بقدم حرکت کر رہا تھا۔ یکا یک نانؒا کی طرف نگاہیں متوجہ ہو گئیں۔ ان کے پیروں کی طرف ایک طویل القامت شیر ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ بڑی آہستہ خرامی سے، بڑے ادب کے ساتھ۔

شیر نیم وا آنکھوں سے نانا تاج الدینؒ کی طرف دیکھ رہا تھا، ذرا دیر میں وہ پیروں کے بالکل قریب آ گیا۔ نانؒا گہری نیند میں بے خبر تھے۔ شیر زبان سے تلوے چھو رہا تھا، اس کی آنکھیں مستانہ واری سے بند ہو گئیں۔ سر زمین پر رکھ دیا۔

نانا تاج الدینؒ ابھی تک سو رہے تھے۔

شیر نے اب زیادہ جرأت کر کے تلوے چاٹنا شروع کر دیئے۔ اس حرکت سے نانؒا کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شیر کے سر پر ہاتھ پھیرا ــــ کہنے لگے،

''تو آ گیا۔ اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے، میں تجھے تن درست دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ اچھا اب جا۔''

شیر نے بڑی ممنونیت سے دم ہلائی اور چلا گیا۔

• • ——————— • •

میں نے ان واقعات پر بہت غور کیا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ شیر پہلے کبھی نانؒ کے پاس آیا تھا۔ مجبوراً اس امر کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ نانؒ اور شیر پہلے ہی سے ذہنی طور پر روشناس تھے۔ روشناسی کا طریقہ ایک ہی ہوسکتا ہے۔ انا کی جولہریں نانؒ اور شیر کے درمیان ردّ و بدل ہوتی تھیں وہ آپس کی اطلاعات کا باعث بنتی تھیں۔ عارفین میں کشف کی عام روش یہی ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں میں بھی کشف اسی طرح ہوتا ہے۔ کشف کے معاملہ میں انسان اور دوسری مخلوق یکساں ہیں۔

یہ قانون بہت فکر سے ذہن نشین کرنا چاہئے کہ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دور کرتے رہتے ہیں، ان میں بہت زیادہ ہمارے معاملات سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قریب اور دور کی ایسی مخلوق سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہو۔ اس مخلوق کے تصورات لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان تصورات کا جوڑ اپنی زندگی سے ملانا چاہتے ہیں تو ہزار کوشش کے باوجود ناکام رہ جاتے ہیں۔ انا کی جن لہروں کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے ان کے بارے میں بھی چند باتیں فکر طلب ہیں۔

سائنس دان روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کردے۔ البتہ انا کی لہریں لامتناہیت میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں ان لہروں کے لئے زمانی مکانی فاصلے موجود ہی نہیں ہیں۔ روشنی کی لہریں جن فاصلوں کو کم کرتی ہیں انا کی لہریں ان ہی فاصلوں کو بجائے خود موجود نہیں جانتیں۔

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی

لہریں جن کے معنی معین کر لئے جاتے ہیں سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو انا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں نہیں ہوتی بلکہ دور دراز ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من وعن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

انبیائے کرام اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں۔ ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب وشہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے، چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب وشہود کی فراست اور معنویت کائنات کی رگِ جان ہے۔ ہم اس رگِ جاں میں جو خود ہماری اپنی رگِ جاں بھی ہے، تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارہ اور دوسرے سیاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصورات، جنات اور فرشتوں کی حرکات وسکنات، نباتات و جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کر سکتے ہیں۔

مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت انا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

فقیر کی ڈاک

تفکر ـــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ـــ عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ’فقیر کی ڈاک‘‘ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ماضی کے اوراق میں سے ایک خط پیش خدمت ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

درخواست ہے کہ جس قدر ممکن ہو اور شعور کے دائرہ کار میں آجائے تحریر فرمائیں کہ عالم اعراف کیا ہے۔

اشفاق حسین۔ مانچسٹر (برطانیہ)

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

عالم اعراف کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

’’خرابی ہے کم تولنے والوں کے لئے، جن کا یہ حال ہے کہ جب لوگوں سے ناپ لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن اٹھا کر لائے جانے والے ہیں۔ اس دن جب کہ سب لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہرگز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال قید خانہ (سجین) میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ قید خانہ کا دفتر سجین کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لئے، ان لوگوں کے لئے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور روز جزا کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے بدعمل ہیں۔ انہیں جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، یقیناً اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم ہوں گے پھر جہنم میں جا پڑیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلا دیا کرتے تھے۔ ہرگز نہیں، بے شک نیک آدمیوں کا نامۂ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر (علیین) میں ہے اور تجھ کو کیا خبر، کیا ہے علیین؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی، اس کو دیکھتے ہیں مقربان بارگاہ۔ بے شک نیک لوگ ہیں آرام میں، اونچی مسندوں اور تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم آرام

اور تازگی محسوس کروگے۔ان کو نفیس ترین شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے۔مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارہ کرتے تھے،اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب دیکھتے تو کہتے تھے یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں حالاں کہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے۔آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں۔مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔اب بدلہ پایا منکروں نے جیسا کرتے تھے۔'' (المطففین:۱۔۳۶)

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیات مرنے کے بعد زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔روحانی نگاہ دیکھتی ہے کہ ہر آدمی کے کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں اور کچھ لکھ رہے ہیں لیکن لکھنے کی طرز یہ نہیں ہے جو ہماری دنیا میں رائج ہے۔نہ ان کے ہاتھوں میں قلم ہے اور نہ سامنے کسی قسم کا کاغذ ہے۔فرشتوں کا ذہن کوئی بات نوٹ کرتا ہے اور وہ بات فلم کی طرح ایک جھلی پر نقش ہو جاتی ہے۔ان روحانی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں جو عمل کرتا ہے اور عمل کے پس پردہ جو سوچ کام کر رہی ہے وہ فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو جاتی ہے، جسے قرآن کریم نے کتاب المرقوم کہا ہے۔ مرنے کے بعد انسان یہ فلم (کتاب المرقوم) دیکھتا رہتا ہے۔برے آدمی کے سامنے اس کے برے ارادوں، برے اعمال اور برے اعمال پر ضمیر کی ملامت فلم کی صورت میں ڈسپلے ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر شدید اذیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔یہ اذیت پچھتاوا بن کر اس پر مسلط رہتی ہے۔نیک انسان مرنے کے بعد جب اپنے نیک ارادوں، نیک اعمال اور اعمال کے نتیجہ میں ضمیر پر طاری ہونے والی سکون کی کیفیت کو دیکھتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت اور قربت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ہر آدمی فلم دیکھتا ہے اور مناظر کی نوعیت سے وہ فلم دیکھ کر کبھی قہقہے لگاتا ہے اور کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ کبھی آنسوؤں سے رونا شروع کر دیتا ہے حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ جو فلم میں دیکھ رہا ہوں وہ کس کی لکھی ہوئی کہانی ہے۔

اعراف (مرنے کے بعد قبر کی زندگی) میں جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ میں چوری کر رہا ہوں اور میرا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے تو اس منظر کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو کر رونے چیخنے لگتا ہے۔چوں کہ فلم پوری زندگی کی ہے اس لئے جب دوسرے اعمال کی فلم دیکھتا ہے تو ہاتھ کٹنے کی اذیت بھول جاتا ہے اور پھر جب چوری کی فلم کے مناظر سامنے آتے ہیں تو آدمی رونے لگتا ہے اور یہ صورت یوم حساب قائم ہونے تک رہے گی۔یوم انصاف کے بعد جنت دوزخ کے مراحل ہیں۔اللہ رحیم و کریم ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے، ''ایک دن دوزخ کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

دعا گو، عظیمی (جنوری 1990ء)

نامے میرے نام

خواتین وحضرات قارئین — السلام علیکم، ذہن میں ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے مطالعہ کے بعد کوئی ایسا خیال آتا ہے جس کا جواب نہ ملنے سے تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ آپ لکھئے — اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ انشاءاللہ جواب شائع کیا جائے گا۔

جون 2019ء کے سرورق کی خواتین وحضرات نے تعریف کی۔ منتخب خطوط پیش خدمت ہیں:

شمع نسیم (متحدہ عرب امارات): ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے جتنے سرورق ہیں، منظر نگاری کے لحاظ سے بلاشبہ جون 2019ء کا سرورق پہلے نمبر پر ہے۔ زیادہ متوجہ کرنے والی تصویر بچہ کی ہے کہ وہ اسلاف کو دیکھ رہا ہے

جویریہ (کراچی): جون 2019ء کے سرورق میں دریا کو کوزہ میں بند کیا گیا ہے۔ ہر منظر اپنی کہانی آپ ہے۔ غور سے دیکھنے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے جیسے ہم اس دور میں داخل ہوگئے ہیں۔ سب سے زیادہ ہجوم (تصاویر) موجودہ دور میں ہے۔ بچہ کے ساتھ پودے کی تصویر ہے۔ یقیناً اس میں بھی کوئی نکتہ ہے۔

ڈاکٹر حسن محمود (برطانیہ): جان دار، مختصر اور جامع — اس دنیا کی فلم جون 2019ء کے سرورق پر پرنٹ کردی گئی۔ بچہ سے لے کر غاروں سے اوپر بنے پہاڑ تک — ہر جز مکمل تفصیل ہے۔ سرورق دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک بڑا ذہن ہے اور یہ ذہن یقیناً محترم عظیمی صاحب کا ہے۔

شہزاد احمد (میرپور): ایک دور کی انتہا دوسرے دور کی ابتدا ہے۔ غاروں سے شروع ہونے والی کہانی خلا میں سفر تک پہنچ گئی ہے۔ بچہ کے شعور میں نوعی ریکارڈ کی موجودگی ٹائم اور اسپیس کی نفی ہے۔

مہرین حسین (کراچی): بچہ اپنے آباؤ اجداد کی تصویر ہے۔ ہر گزرنے والا دور ہر پیدا ہونے والے بچہ کے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ کہانی خود کو دہراتی رہتی ہے۔ کہانی خود کو بار بار کیوں دہراتی ہے اور کب تک دہرائے گی؟

★ ——— ★

جون 2019ء کے ''آج کی بات'' پر قارئین کا تفکر پڑھئے۔

عبدالخالق (میانوالی): زندگی کا مقصد اللہ کی پہچان ہے۔ اللہ کی آواز کہ ''کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟''

روح کا ریکارڈ ہے۔ روح کائنات کا اجتماعی شعور ہے۔ الست بربکم میں انکار اور اقرار کا اختیار دیا گیا ہے۔ اختیار کے استعمال کے لئے روح لباس (انفرادی شعور) تخلیق کرتی ہے جسے نسمہ کہتے ہیں۔ نسمہ ایک طرف (مادی جسم) خارجی دنیا اور دوسری طرف روح سے وابستہ ہے۔ نسمہ بااختیار ہے کہ چاہے تو روح کی انسپائریشن قبول کرے اور چاہے رد کردے۔ علوم کا تعلق فزکس، نفسیات یا پیراسائیکالوجی سے ہو، سب کا محرک روح کی انسپائریشن ہے۔ انسپائریشن کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ کیا آنے والا ہر خیال اس عہد کا اعادہ نہیں کرتا کہ خالق و مالک اللہ ہے، اس سے واقف ہونے کی جستجو کرو ــــ؟

صفیہ قاضی (حیدرآباد): خود کو دیکھنے کے لئے کسی اور کو دیکھنا ضروری ہے اسی لئے کائنات کو آئینہ بنایا گیا ہے۔ اگر کائنات آئینہ نہ ہوتی تو سب گونگو کی کیفیت میں ہوتے۔ خود سے ناواقف اور دوسروں سے انجان!

عظمیٰ کریم (کراچی): ''نفی اثبات کائنات کا پہلا سبق ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی آواز سن کر مخلوق کو اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ اپنی نفی کیوں ضروری ہے؟ ہم ایک دوسرے سے شکل وصورت، جس کو لباس کہا جاتا ہے کی بنیاد پر الگ ہیں۔ شکل وصورت روز بدلتی ہے اور بدلنے والی شے تغیر ہے۔ تغیر دنیا کو چلانے اور افزائش کے لئے نظام کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنی پیدائش پر غور کرو۔ ہماری پیدائش پہلے دن سے آخر تک تغیر ہے۔ لیکن اندر میں ایک وجود نہیں بدلتا۔ لباس نے جس جز کو چھپایا ہوا ہے اس میں تغیر نہیں اور وہ روح ہے ــــ روح اللہ کا امر ہے۔ جسم کی نفی اور روح کا اثبات کر کے ہم کائنات کے پہلے سبق نفی اثبات کے امتحان میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

منیبہ شاہ (مردان): کسی کو محسوس کر کے پہلے اپنی نفی کرتے ہیں پھر اس کا اثبات کرتے ہیں۔ جیسے میں نے آسمان کو دیکھا تو ذہن سے اپنا خیال محو ہو گیا۔ پلک جھپکنے پر احساس ہوا کہ آسمان اور میں الگ ہوں۔

صائمہ نصیر (فیصل آباد): قالوا بلیٰ اپنی نفی اور خالق کا اثبات ہے جس سے یہ بات یقین میں داخل ہو گئی کہ تمام روحوں نے اللہ کو دیکھا ہے۔ ہمیں اس عہد کی تجدید کرنی ہے اور اس کا راستہ غور وفکر ہے جس سے شعور لاشعوری دنیا سے واقف ہوتا ہے۔

رحیمہ نثار (پاک پتن): جب ہم آواز سنتے ہیں یا دیکھتے ہیں تو دراصل نفی اثبات کے مرحلہ سے گزرتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم کسی کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ کسی کی بات سن سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نفی اثبات کی صلاحیت خالق سے واقف ہونے کے لئے استعمال کریں۔

مہرالنسا (کراچی): بندہ خوش بو اور بدبو اس لئے محسوس کرتا ہے کہ دونوں اس سے الگ ہیں۔ پھر خوش بو میں رہ کر خوش بو نہیں آتی اور بدبو میں رہ کر بدبو کا احساس نہیں ہوتا۔ ابا جی نے سوال پوچھنے سے پہلے اس

پیرا گراف کی پہلی سطر میں جواب دے دیا کہ ''احساس کا تعلق دوئی سے ہے۔''

محمد عمران (لاہور): ''احساس کا ایک مرحلہ ضم ہونا ہے اس لئے احساس کی دنیا میں پھول اور آدم ایک ہیں۔'' یہ سطر پڑھنے کے بعد پھول کی پتیاں ہاتھ میں لے کر تجربہ کیا۔ جسم میں پتیوں کی لطافت کا کرنٹ محسوس ہوا اور چند لمحوں تک صرف پھول کا احساس رہا۔ معلوم ہوا کہ احساس کی دنیا میں پھول اور آدم ایک ہونا کیا ہے۔

محمودہ بیگم (لودھراں): ''خبر نہ ہو کہ میں کون ہوں تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔'' یہ بات مادی دنیا اور الوژن سے واقف ذہن کا خلاصہ ہے۔

رباب احمد (ملتان): سورۃ الاخلاص کی روحانی تشریح قرآن کریم کو غور سے پڑھنے کی دعوت ہے۔ ہم نے آج تک سورۃ الاخلاص ایسے نہیں پڑھی۔ اس میں تمام ڈائی مینشن کی نفی کر دی گئی ہے اور اللہ کی خالقیت اور ربوبیت کا اثبات ہے۔

★ ——————— ★

مضامین پر موصول تبصروں میں سے منتخب خطوط یہ ہیں:

عائشہ قیوم (لاہور): مضمون نگاروں کی تحریر میں محترم عظیمی صاحب کا تصرف محسوس ہوتا ہے۔ حمد اللہ تعالیٰ اور نعت رسول پاکؐ سے محبت کا اظہار ہے۔ ابدالِ حق قلندر باباؒ کی رباعی اور تشریح مفروضہ حواس کی گرفت پر ضرب لگاتی ہے اور ''آج کی بات'' قرب کے احساس سے ہم کنار کرتی ہے۔ درخواست ہے کہ ''آج کی بات'' کتابی شکل میں شائع کریں۔ آپ کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی روحانیت کے پیاسوں کی تشنگی دور کرے گی۔ تمام مضامین معیاری اور تفکر طلب ہیں۔ ''اللہ میاں کے باغ کے پھول'' بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ بچوں کو اس میں موجود کہانیاں سنائی جائیں اور تفکر کی دعوت دی جائے تو ان پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ سارہ خان بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسالہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے، آمین۔

انیلا انجم (کراچی): ''ماہنامہ قلندر شعور'' کی تعریف ایسی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ مضامین میں گہرائی کے ساتھ علم و دانش مندی کے گوہر ہیں۔ خصوصاً اباجی کی تحریروں میں بار بار تفکر کی دعوت علم و آگہی کے دروازے کھولتی ہے۔ جتنا زیادہ غور و فکر کیا جائے، اتنا کم ہے۔ رسالہ کو پڑھنے کے لئے ایک مہینہ کم ہے۔ درخواست ہے کہ میرے لئے اور میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لئے دعا کریں کہ ہمارے وقت میں برکت ہو اور ہم اس علم و آگہی کے سمندر کو فکر کی گہرائیوں کے ساتھ اپنے اندر جذب کر سکیں اور اس کے ثمرات سے اللہ کی مخلوق کی خدمت کریں۔

شائستہ کلثوم (کراچی): جون 2019ء میں ''فقیر کی ڈاک'' سبق آموز ہے۔

نورخالق (چشمہ میانوالی): بچوں کا سلسلہ ''اللہ میاں کے باغ کے پھول'' میں ''کہانی کا نام ــــ؟'' پر مذاکرہ کیا۔ اس بار ماشاءاللہ 26 بچوں نے شرکت کی۔ کہانی پڑھ کر سوالات ترتیب دیئے گئے۔ سوالات اور جوابات یہ ہیں۔

۱۔ سورج سیاہ توے کی طرح کیسے ہے اور اس کی روشنی کہاں سے آتی ہے؟ جواب: زمین روشن ستارہ ہے۔ زمین کی روشنی کا عکس سورج پر منعکس ہوتا ہے تو سورج اس عکس کو واپس زمین پر لوٹاتا ہے جس سے زمین روشن نظر آتی ہے۔ ۲۔ چاند اور سورج نے سرگوشی کون سی زبان میں کی؟ جواب: چاند اور سورج نے سرگوشی خیالات کی زبان میں کی۔ خیالات کی زبان سب کو آتی ہے۔ خیالات لہروں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ۳۔ اس کہانی سے ہم نے کیا سیکھا؟ جواب: آدمی میں تغیر ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے دھوپ اچھی ہے، کبھی کہتا ہے بارش اچھی ہے۔ پھر کہتا ہے روشنی اچھی ہے اور کبھی اسے اندھیرا اچھا لگتا ہے۔ اس تغیر کی وجہ سے وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ جو اللہ کی مرضی ہے وہی ہوتا ہے تو وہ پریشان نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ خوش رہے گا۔

کہانی کا عنوان رکھنے کو کہا گیا تھا۔ سب نے کوئی نہ کوئی عنوان بتایا جیسے، ۱۔ ناشکرا کون؟ ۲۔ چاند، سورج اور بارش ۳۔ راضی بہ رضا ۴۔ خوش رہنے کا فارمولا ۵۔ درویش اور عوام۔

بنت سلیم (کراچی): ''نامے میرے نام'' نے باقاعدہ مضمون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ خوشی ہے کہ مسائل کے حل کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ کے اندر خدمت خلق کا جذبہ دراصل اللہ سے محبت کا جنون ہے۔ یہی جنون آپ کو ہمہ وقت خلق خدا کی بھلائی کے لئے دن رات مصروف رکھتا ہے۔ یہ اللہ کے دوست کی اللہ سے محبت اور اللہ کی مخلوق کے لئے ایثار ہے۔ رسالہ میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی لائی جاتی ہے جو اچھی بات ہے۔

شگفتہ شاہد (سوات): جون 2019ء میں مضامین کا انتخاب عمدہ ہے۔ عابد محمود صاحب کی تحریر ''ہائے! بے چارے کی اماں مرگئی ہے'' نے عجیب تاثر پیدا کیا جسے میں نام دینے سے قاصر ہوں۔ پڑھ کر گم سم ہوگئی۔ اور پھر رونا آ گیا۔

محمد اعظم (لاہور): ''گوری کرت سنگھار'' بہت پسند آیا۔ گھر کی خواتین نے بھی بصد شوق پڑھا۔ ہلکی پھلکی معلوماتی تحریر ہے۔ اب تو آدمی بھی سنگھار کرنے لگے ہیں۔ اس پر بھی مضمون آنا چاہئے۔

★ قارئین خواتین و حضرات! ''آدمی بھی سنگھار کرتے ہیں'' کے عنوان سے مضامین لکھیں۔ انشاءاللہ شائع کیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ مضمون ''ماہنامہ قلندر شعور'' کی پالیسی کے مطابق ہو۔

سہیل احمد

دو تھال میں سارا ہے

بامراد عورت نے بچہ ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ دوسری عورت برداشت نہیں کرسکی اور روتے ہوئے عرض کیا، باباجی! میرا بچہ ــــ؟ شان بے نیازی سے فرمایا، ریت میں ہے، نکال لے!

لفظ صداقت کی معنویت پر غور کیا جائے تو وجود میں توانائی کا چشمہ ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کائنات کی ساری توانائی اس لفظ میں مخفی ہے اور یہ لفظ خود کتنا گہرا اور وسیع ہے ــــ اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم!

ہر پیغمبر اور رسول نے صداقت کی تعلیم دی۔ یہی تعلیم انبیائے کرام کے پیروکار اولیاء اللہ دیتے ہیں۔ سلسلہ عظیمیہ کے قواعد وضوابط میں شامل ہے کہ جس ذہن میں شک ہو وہ عارف نہیں ہوسکتا۔ اللہ کے دوست شک سے دور اور یقین سے روشن ہوتے ہیں۔ پاکیزہ خیالات، اعلیٰ کردار و گفتار اور علم و عرفان سے آراستہ خواتین و حضرات اولیاء اللہ میں ایک ہستی حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ ہیں۔

اولیاء اللہ کی سوانح حیات بتاتی ہے کہ اعلیٰ مراتب کی حامل ہستیوں کی بشارت ان کی پیدائش سے قبل خواب یا اشاروں کے ذریعے والدین کو دی جاتی ہے۔

بابا تاج الدینؒ کی والدہ مریم بی صاحبہؒ نے خواب دیکھا کہ چاند آسمان پر آب و تاب سے چمک رہا ہے اور فضا چاندنی سے معمور ہے۔ یکا یک چاند آسمان سے گیند کی طرح لڑھک کر ان کی گود میں آگرا اور دنیائیں اس کی روشنی سے منور ہوگئیں۔

بابا تاج الدینؒ چھوٹے تھے کہ والدین کا انتقال ہوگیا۔ نانی نے پرورش کی۔ جن دنوں آپ کی فوج میں ملازمت تھی، نانی کو معلوم ہوا کہ آپ رات کو غائب رہتے ہیں۔ فکرمند ہوئیں اور ملاقات کے لئے آئیں۔ رات کو نانی نے خاموشی سے پیچھا کیا۔ دیکھا کہ نواسہ کسی مزار میں داخل ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اندر گئیں تو ذکر و فکر میں مشغول پایا۔ دل پر سے بوجھ اتر گیا اور دعائیں دیتے ہوئے خاموشی سے آگئیں۔

صبح بابا تاج الدینؒ کے ہاتھوں میں چھوٹے پتھر تھے۔ نانی نے ناشتا دیا تو پتھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، نانی! میں تو یہ لڈو پیڑے کھاتا ہوں۔ اور پتھروں کو مٹھائی کی طرح کھانے لگے۔

نانی اشارہ سمجھ گئیں اور خاموش رہیں۔

بابا تاج الدینؒ کی نسبت سے متعلق آپ کے نواسہ ابدالِ حق قلندر باباؒ فرماتے ہیں،

''بابا تاج الدینؒ کو حضرت عبداللہ شاہؒ کی قربت حاصل ہوئی تھی اور نسبت چشتیہ بابا داؤد کیؒ کے مزار پر منتقل ہوئی تھی۔ لیکن بابا صاحب کی تعلیم و تربیت خود جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؑ، حضرت اویس قرنیؓ نے کی ہے۔ نیز بابا صاحبؒ کو ہر سلسلہ کے اکابر اولیاء اللہ کی ارواح سے فیض حاصل ہوا ہے۔''

بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے کئی ارشادات میں اویسیہ فیضان کی طرف اشارہ ہے۔ اپنی ولایت کے رنگ و نسبت کو اکثر یہ کہہ کر ظاہر کرتے تھے کہ ہمارا نام تاج محی الدین، تاج معین الدین ہے۔ کبھی یہ بھی فرماتے کہ ہمارا نام تاج الاولیا، تاج الملت والدّین، شہنشاہ ہفت اقلیم، سید محمد تاج الدین ہے۔

نانا تاج الدینؒ فوج کی ملازمت کے بعد کامٹی آئے تو جذب و بے خودی عروج پر تھی۔ علم و عرفان سے ناواقف لوگوں نے ان کے استغراق کو پاگل پن سے تعبیر کیا۔ پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ ہر طرف آپ کے صاحب کرامت ہونے کا شہرہ ہونے لگا۔ لوگ مسائل کے حل کے لئے آپ کے پاس آتے۔ ہجوم تیزی سے بڑھا۔ جب رات دن کا فرق نہ رہا تو ایک روز نانا تاج الدینؒ نے فرمایا،

''لوگ ہمیں بہت ستاتے ہیں، اب ہم پاگل جھونپڑی چلے جائیں گے۔''

حالات ایسے بنے کہ ناگپور کے پاگل خانہ میں داخل کر دیا گیا۔ پاگل خانہ — پاگل خانہ نہ رہا۔ ملاقات و مسائل کے لئے ہر خاص و عام حاضر ہوتا۔ پاگل خانہ کے منتظمین اور ڈاکٹر بہت خیال رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں شکر درا، واکی اور کئی علاقے راجا رگھو جی راؤ کی ملکیت تھے۔ راجا کی بہو کے یہاں بچہ کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ ماں اور بچہ دونوں کو خطرہ ہے۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ پاگل خانہ حاضر ہوئے۔ بابا تاج الدینؒ کو بتایا گیا کہ راجا رگھو راؤ حاضر ہونا چاہتے ہیں تو فرمایا، ہم فقیر جی حضرت، ہمارے سے راجا کا کیا کام حضرت!

راجا سامنے آیا تو آپ نے فرمایا، ادھر کیا کرتے جی حضرت! ادھر جانا لڑکا پیدا ہوا تو خوشیاں منانا!

گھر پہنچے تو شادیانے بج رہے تھے۔ راجا معتقد ہو گیا اور پاگل خانہ سے محل میں لے آیا۔ محل کا بیرونی بڑا حصہ نانا تاج الدینؒ کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا۔

اولیاء اللہ خدمت خلق اور علم سے محبت کرنے والی ہستیاں ہیں۔ جہاں جاتی ہیں، خدمت کے در کھول دیتی ہیں اور علم کا گلستان آباد کر دیتی ہیں جس میں پھول کھلتے، مہکتے اور آنے والوں کو مسحور کرتے ہیں۔

شکر درا میں کچھ عرصہ قیام کے بعد بابا تاج الدینؒ واکی آ گئے۔ قیام گاہ سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر آم کا درخت تھا۔ آپ اس مقام کو شفا خانہ کہتے تھے۔ علاج

سے مایوس مریض یہاں ٹھہرتے تھے۔ شفاخانہ کے قریب ایک جگہ کو مدرسہ قرار دیا۔ دعا یا فہم و فراست میں اضافہ کے لئے جو طلبا دربار تاج الاولیا میں حاضر ہوتے، آپ انہیں مدرسہ میں قیام کا حکم دیتے۔ اپنی جائے قیام کے پاس ایک جگہ کو مسجد کا نام دیا تھا۔

نانا تاج الدینؒ جہاں گئے کسی نہ کسی مقام کو مسجد قرار دیا۔ منتشر خیال اور شکوک و وسوسوں میں مبتلا افراد کو مسجد میں نماز کا حکم دیتے۔

واکی ہو یا شکر درہ — لوگ دیکھتے کہ بابا تاج الدینؒ ابھی ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں تو کچھ دیر بعد جنگل میں کسی درخت کے نیچے تشریف فرما ہیں۔

بعض اوقات ہجوم میں گھر جاتے تو بلند آواز سے فرماتے، تم سب جاؤ تمہارے کام ہو گئے۔ لوگ مطمئن واپس جاتے اور اللہ تعالیٰ ان کے کام بنا دیتا۔

بابا تاج الدینؒ نے اللہ سے تعلق اور عمل میں اخلاص کی تاکید کی۔ تکلیف پہنچانا اور ظلم سخت ناپسند تھا۔ فرماتے تھے کہ اللہ اللہ کرتے اچھے رہتے۔

سوچ اور عمل میں خامی کو لطیف پیرائے میں ظاہر کرتے کہ متعلقہ فرد سمجھ جائے اور پردہ پوشی رہے۔

کسی نے روحانیت میں ترقی کے لئے دعا کی درخواست کی تو فرمایا، کتا مار کر لاؤ ہم دونوں کھائیں گے۔ اشارہ اس حدیث کی طرف تھا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔

سود خوری میں مبتلا شخص ملنے آیا۔ آپ نے لکڑی اٹھائی اور مارتے ہوئے کہا، بڑا ظالم ہے مخلوق کو ستاتا ہے، سود لینا چھوڑ دے! اس کے دل پر اثر ہوا اور توبہ کر لی۔

ایک عقیدت مند مولانا یوسف شاہ کی کسی درویش سے راہ و رسم ہو گئی۔ درویش کیمیا جانتا تھا، ان کو ترکیب بتا دی۔ یوسف شاہ نے سوچا اگر بابا تاج الدینؒ اجازت دیں تو بغیر مشقت کے اچھی آمدنی کا ذریعہ بن جائے گا۔ بابا صاحبؒ کے پاس گئے تو فرمایا، غلاظت کھانا چاہتے ہو؟ یوسف شاہ سنبھل گئے۔

بابا تاج الدینؒ کی تربیت کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ لوگ حرص و ہوس سے نکل آئیں۔ کبھی سخت لہجہ بھی اختیار کرتے لیکن دل محبت سے لبریز تھا۔

اللہ کے دوستوں نے ہمیشہ نوع انسانی کو سکون و راحت کی دولت سے نوازا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ باباؒ آپ لوگوں کو سخت سست کیوں کہتے ہیں؟ فرمایا، نہیں رے میں تو انہیں دعا دیتا ہوں۔

بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی ذات بابرکات کشف و کرامات کے ضمن میں ممتاز ہے۔ فطرت میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ خرق عادت بطور عادت سرزد ہوتی تھی۔

ایک شخص نے حج کے دوران بابا تاج الدینؒ کو جبلِ عرفات پر دیکھا۔ ادراک ہوا کہ یہ صاحبِ اختیار بزرگ ہیں۔ نام اور پتہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں ناگپور کی پاگل جھونپڑی میں رہتا ہوں، نام

تاج الدین ہے۔ اتنا فرما کر وہاں سے اٹھ گئے۔

وہ صاحب حج کے بعد ناگپور آئے۔ ملاقات میں اشتیاق ہوا کہ کرامت دیکھیں۔ یہ سوچ رہے تھے بابا تاج الدینؒ قریب آئے ، انگوٹھا اور انگشت شہادت ان کی آنکھوں پر رکھ کر فرمایا: کیا بابا! یہی جبلِ عرفات ہے جہاں اپن حج کو گئے تھے؟

ان صاحب نے بند آنکھوں سے خود کو جبلِ عرفات پر دیکھا، وہی وقت، وہی رونق، وہی مجمع!

عرض کیا، بے شک یہی جبلِ عرفات ہے۔ یہ تو آپ نے دکھا دیا مگر مقام رب العالمین تو دکھایئے۔

بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے ہاتھ ہٹا لیا اور فرمایا: بابا اتنی دور کون جائے!

ایک عقیدت مند ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے تقریب میں شرکت کے لئے ممبئی جانے کا ارادہ کیا۔ نانا تاج الدینؒ سے اجازت چاہی تو فرمایا، مت جاؤ! راستہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔ ان کے اصرار پر آپ نے درخت سے پتا توڑ کر دیا کہ سفر میں ساتھ رکھنا۔

ڈاکٹر عبدالحمید روانہ ہوئے۔ راستہ میں کسی ضرورت کے سبب بُھساول ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ ریلوے لائن پار کر رہے تھے کہ اچانک ریل گاڑی آتی دکھائی دی۔ ڈاکٹر صاحب خوف سے پٹری پر گر گئے۔ ریل پوری رفتار سے قریب آ رہی تھی اور پھر نزدیک آ کر رک گئی۔ لوگوں نے اٹھنے میں مدد کی اور پوچھا کہ آپ کوئی عامل ہیں کہ انجن روکے بغیر خود بخود رک گیا—؟

ڈاکٹر عبدالحمید نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔

بابا تاج الدینؒ ندی کے پاس ریت پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دو خواتین ملنے آئیں۔ شادی کو بارہ چودہ سال گزر گئے تھے لیکن وہ اولاد سے محروم تھیں۔ آپ نے جھولی میں سے دو لڈو نکالے اور چکھ کر ان عورتوں کو دیتے ہوئے کہا، کھالو! ایک نے کھالیا، دوسری نے نظر چھپا کر ریت میں دبا دیا۔ وقت مقررہ پر لڈو کھانے والی عورت صاحب اولاد ہوئی جب کہ دوسری کی گود خالی رہی۔ بچہ کو لے کر خدمت میں حاضر ہوئی۔ دوسری عورت کو بھی تسلی دیتے ہوئے ساتھ لیا۔

بابا تاج الدینؒ ندی کے کنارے اسی مقام پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ بامراد عورت نے بچہ ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ دوسری عورت برداشت نہیں کر سکی اور روتے ہوئے کہا، بابا جی! میرا بچہ —؟ بابا تاج الدینؒ نے شان بے نیازی سے فرمایا، ریت میں ہے، نکال لے!

لوگوں نے عورت سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو اس نے سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ جب تک بابا دعا نہیں دیں گے، یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تیسرے روز ملاقات میں بابا تاج الدینؒ نے دعا دی۔ اللہ کے فضل سے اس خاتون کو بھی اولاد کی نعمت عطا ہوئی۔

قارئین خواتین وحضرات! نانا تاج الدینؒ کے الفاظ کہ ''ریت میں ہے، نکال لے'' پر غور وفکر کریں اور جو توجیہ سمجھ میں آئے، ادارہ کو بھیج دیں۔

سی پی گورنمنٹ کے فاریسٹ کنزرویٹر سید عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں ایک چور حاضر ہوا اور ایک طرف بیٹھ کر دل ہی دل میں عرض کیا، حضور! مجھ سے چوری کا ارتکاب ہوا ہے۔ حلوائی کے یہاں چوری کی ہے اور سخت نادم ہوں۔ میری پردہ داری کرتے ہوئے سزا سے بچا لیجئے۔

اس خاموش عرض کے جواب میں بابا تاج الدینؒ نے اس کی طرف رخ کر کے فرمایا، جا تیرا کام ہو گیا!

اتنے میں وہ حلوائی جس کے یہاں چوری ہوئی تھی فریاد لے کر حاضر ہوا۔ حضور! میں لٹ گیا۔ تمام کمائی کسی نے چرالی۔

فرمایا، ارے جا! دوتھال میں سارا ہے۔ اس کا کام بھی ہو گیا، تیرا بھی ہو جاتا۔ جا اور دکان کھول!

حلوائی واپس پہنچا۔ کمائی لٹ چکی تھی لیکن دوتھال چوری سے بچ گئے تھے۔ بابا صاحبؒ کا ارشاد یاد تھا کہ دوتھال میں سارا ہے۔ مکمل یقین سے دوتھالوں سے کاروبار شروع کیا۔ برکت ہوئی اور پہلے سے زیادہ خوش حال ہوا۔

تاج ملت و دین — بابا تاج الدینؒ کی کرامات بے شمار ہیں۔ پتوں کا کیڑا بننا، گوالے کا زندہ ہونا، شیر کی عقیدت، دیوار میں سے گزرنا، ایک وقت میں کئی مقامات پر موجودگی وغیرہ — ہر کرامت علم و حکمت، ٹائم اسپیس کے قانون اور تخلیقی فارمولوں سے مزین ہے۔

شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدینؒ کے شاگردوں میں بڑے بڑے نام ہیں۔ ان میں آپ کے نواسہ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ سرفہرست ہیں۔ فرماتے ہیں،

''نانا تاج الدینؒ جیسی برگزیدہ ہستی ساڑھے تین ہزار سال میں اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی کرم سے پیدا کرتا ہے۔ یہ ساری کائنات چار نورانی آبشاروں پر قائم ہے۔ نانا تاج الدینؒ کی عظمت کا حال یہ ہے کہ نور اور تجلیات کی ان چار آبشاروں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتے ہیں کہ ایک قطرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ رسول اللہؐ سے قربت کا یہ عالم ہے کہ حضور رحمۃ للعالمینؐ نے اپنے اس فرزند کی کوئی بات کبھی نامنظور نہیں کی۔''

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے بابا تاج الدینؒ کی ایک علمی محفل کا احوال تحریر کیا ہے جس میں راجا رگھوراؤ کے سوال پر شہنشاہ ہفت اقلیم کے جواب کا ہر لفظ اسرار و رموز سے لبریز ہے۔ ابتدائی حصہ مختصر پیش ہے۔

راجا رگھوراؤ نے سوال کیا — ''بابا صاحب! ایسی مخلوق جو نظر نہیں آتی مثلاً فرشتہ یا جنات خبر متواتر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جتنی آسمانی کتابیں ہیں ان میں اس قسم کی مخلوق کے تذکرے ملتے ہیں۔ ہر مذہب میں بدروحوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے لیکن عقلی اور عملی توجیہات نہ ہونے سے ذی فہم انسانوں کو سوچنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رکتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے۔ تجربات جو کچھ زبان زد ہیں وہ انفرادی ہیں اجتماعی نہیں، آپ اس مسئلہ پر کچھ ارشاد فرمائیں۔''

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں، جس وقت یہ سوال کیا گیا نانا تاج الدین ناگپوریؒ لیٹے ہوئے تھے۔ان کی نگاہ اوپر تھی۔فرمانے لگے،

''میاں رگھوراؤ! ہم سب جب سے پیدا ہوئے ہیں، ستاروں کی مجلس کو دیکھتے رہتے ہیں۔شاید ہی کوئی رات ایسی ہو کہ ہمارے نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھتی ہوں۔بڑے مزہ کی بات ہے، کہنے میں یہی آتا ہے کہ ستارے ہمارے سامنے ہیں، ستاروں کو ہم دیکھ رہے ہیں، ہم آسمانی دنیا سے روشناس ہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور ماہ وانجم کی کون سی دنیا سے روشناس ہیں اس کی تشریح ہمارے بس کی بات نہیں۔جو کچھ کہتے ہیں قیاس آرائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔پھر بھی سمجھتے یہی ہیں کہ ہم جانتے ہیں۔

زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ جانتا ہے تو یہ قطعاً نہیں سوچتے کہ اس دعویٰ کے اندر حقیقت ہے یا نہیں۔

جو کچھ میں نے کہا اسے سمجھو، پھر بتاؤ کہ انسان کا علم کس حد تک مفلوج ہے۔انسان کچھ نہ جاننے کے باوجود اس کا یقین رکھتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔

یہ چیزیں دور پرے کی ہیں۔جو چیزیں ہر وقت انسان کے تجربہ میں ہیں ان پر بھی نظر ڈالتے جاؤ۔ دن طلوع ہوتا ہے دن کا طلوع ہونا کیا شے ہے۔ ہمیں نہیں معلوم۔طلوع ہونے کا مطلب کیا ہے ہم نہیں جانتے۔دن رات کیا ہیں؟ اس کے جواب میں اتنی بات کہہ دی جاتی ہے کہ یہ دن ہے اس کے بعد رات آتی ہے۔نوع انسانی کا یہی تجربہ ہے۔

میاں رگھوراؤ، ذرا سوچو کیا سنجیدہ طبیعت انسان اس جواب پر مطمئن ہو جائے گا؟

دن رات، فرشتے نہیں ہیں، جنات نہیں ہیں پھر بھی وہ مظاہر ہیں جن سے ایک فرد واحد بھی انکار نہیں کرسکتا۔تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ دن رات کو نگاہ دیکھتی ہے اس لئے قابل یقین ہے۔

لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ نگاہ کے ساتھ فکر بھی کام کرتی ہے۔اگر نگاہ کے ساتھ فکر کام نہ کرے تو زبان نگاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکتی۔نگاہ اور فکر کا عمل ظاہر ہے۔دراصل سارے کا سارا عمل تفکر ہے۔نگاہ محض ایک گونگا ہیولیٰ ہے۔فکر ہی کے ذریعے تجربات عمل میں آتے ہیں۔''

چہرہ پر سادگی ومتانت، قد وقامت میں صبر وعزم، آنکھوں میں جلال اور قلب مجلّا کی حامل کی اس مقرب بارگاہ ہستی نے 35 سال عوام میں رہ کر ان کی خدمت کی، دل ودماغ کو پاکیزگی سے معمور کیا اور علم وعرفان سے نوازا۔بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے وصال کی خبر کو اس وقت کے اخبارات نے جلی حروف سے شائع کیا۔

تاج ملت و دین بابا تاج الدین ناگپوریؒ جیسے قدسی نفس حضرات وخواتین ''مرجاؤ مرنے سے پہلے'' کی حقیقت سے واقف ہیں۔

مسائل کا حل

''ماہنامہ قلندر شعور'' میں ''خواب کی تعبیر'' کے مقبول سلسلہ کے علاوہ پیراسائیکالوجی طریقۂ علاج کے تحت مسائل کے حل کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اگر آپ کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہیں تو ادارہ کو خط لکھ سکتے ہیں۔ خط کے ساتھ ٹوکن منسلک ہونا ضروری ہے۔ ٹوکن جلد شائع کیا جائے گا۔

پیراسائیکالوجی سے متعلق گذشتہ دو شماروں میں جو تفصیلات شائع ہوئیں اس کا خلاصہ یہ ہے:

کائنات کی ابتدا ارادہ سے ہوئی اور ارادہ کائنات میں خیال کی ابتدا ہے۔ خیال میں وہ سب موجود ہے جو کائنات میں ہے۔ آدمی ایجادات کے لئے پہلے سے موجود ''وسائل'' سے مدد لیتا ہے۔ وسائل کو محض مادی اشیا سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے بنیادی وسیلہ خیال کا وارد ہونا ہے۔ سننا دیکھنا، سمجھنا بولنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، لکھنا پڑھنا، غور کرنا— خیال کے تحت ہے۔ خیال پر عمل کو فرد جب اپنے ارادہ سے منسوب کرتا ہے تو مسائل شروع ہوتے ہیں۔ مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ذہن رک گیا ہے۔

ہر فرد اور شے کو خیال کے سبب تحریک مل رہی ہے۔ زندگی تین دائروں میں گزرتی ہے۔

۱۔ فزکس ۲۔ سائیکالوجی ۳۔ پیراسائیکالوجی

فزکس— وسائل کی دنیا ہے۔ فرد وسائل استعمال کرتے ہوئے جن کیفیات و تجربات سے گزرتا ہے وہ سائیکالوجی ہے۔ وسائل اور ان کی طرف متوجہ ہونے کا خیال جہاں سے آرہا ہے وہ علم پیراسائیکالوجی ہے۔

اب آپ پڑھیں گے کہ فرد اگر شے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو شے کی خصوصیات منتقل ہوتی ہیں جیسے کہ مٹی۔ اس کے برعکس فرد خیال کے سورس، خیال کی تحریکات اور خیال کے نظام پر ذہن مرکوز کردے تو ذہن شکوک و شبہات اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہوجائے گا۔

زندگی کیا ہے—؟ دانش وراب تک زندگی کی حتمی تعریف بیان نہیں کرسکے۔ ہر ایک کی رائے مختلف ہے کیوں کہ ہر ایک کا مزاج مختلف ہے۔ کسی نے کچھ کہا تو کسی نے کچھ۔ البتہ ان تعریفوں میں جو پہلو مشترک رہا وہ زندگی کا مشکل یا پیچیدہ ہونا ہے۔ تقریباً سب نے مختلف الفاظ میں اس نکتہ کو واضح کیا۔ یہ تعریف نہیں،

درحقیقت عکاسی ہے کہ زندگی کو سمجھا نہیں گیا اس لئے مشکل یا پیچیدہ کہہ دیا گیا۔ بنیادی وجہ آدمی کی نفسیات ہے اور نفسیات کا دارومدار خواہشات پر ہے۔

علمائے باطن اگر مگر، کاش، غیر واضح اور شاید جیسے الفاظ میں نہیں الجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ باطن کا وقوف رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ زندگی خیال کے اور خیال — امر الٰہی کے تابع ہے۔

''اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو' اور وہ ہوجاتی ہے۔'' (یٰسٓ: ۸۲)

یہ زندگی کی تعریف ہے۔

کائنات میں جہاں بھی حرکت ہے وہاں زندگی ہے۔ روح جسم سے منقطع ہوتی ہے تو جسم کو فوراً ڈیڈ باڈی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جس جسم کو لوگ زید یا حامد کے نام سے پکارتے تھے اب اس کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ ڈیڈ باڈی ہے۔ ماحول کی تبدیلی سے آدمی کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ بات آدمی کی ہورہی ہے، انسان کی نہیں۔ حقیقت جاننے والا روح کی جسم میں موجودگی اور غیر موجودگی — دونوں میں جسم کو ڈیڈ باڈی سمجھتا ہے۔ ایک نفسیات یہ بھی ہے اور یہ ایسی نفسیات ہے جس میں تغیر نہیں ہے کیوں کہ اس سوچ کا تعلق مابعد النفسیات سے ہے۔

باطنی وجود سے واقف فرد جانتا ہے کہ حرکت مٹی یا روشنی کے جسم میں نہیں، کہیں اور سے آرہی ہے۔

مسائل کی بنیادی وجہ جسم کو حرکت کا محرک سمجھنا ہے جس سے معاملات پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے — ؟ یہ بات قبول کرنا کہ حرکت کا محرک جسم ہے دراصل جسم کے خواص کو قبول کرنا ہے پھر ذہن ان خواص کی مناسبت سے کام کرتا ہے۔ جیسے،

① جسم بجنی، کھنکھناتی مٹی اور سڑاند سے بنا ہے:

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں،

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔''

(الطارق: ۵-۶)

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا۔'' (یٰسٓ: ۷۷)

جسم آدمی کا ہو یا کتے بلی کا — تخلیق اسپرم سے ہوتی ہے۔ اسپرم سڑا ہوا بدبودار پانی ہے۔ یہ پانی ان غذاؤں سے بنتا ہے جو ہم کھاتے ہیں۔ غذا کا سورس گوشت ہو، سبزیاں یا پھل — سب کا تعلق زمین سے ہے۔ عالم ناسوت میں زمین کی خاصیت ہے کہ اس میں سے جو شے پیدا ہوتی ہے اس میں سڑاند اور بدبو ہے۔ تعفن کا تعلق شک سے بھی ہے۔ آدمی مثبت اور منفی میں ردّو بدل ہوتا رہتا ہے اور بیش تر وقت شک میں گزارتا ہے، یہ عمل سوچ کو متعفن کرکے خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ سڑاند اور بدبو کا مطلب تغیر ہے۔

② جسم کی ایک خصوصیت تغیر ہے:

سڑاند دراصل ٹوٹ پھوٹ اور تغیر کو ظاہر کرتا ہے کہ

جسم میں تعفن سے پہلے بھی ایک حالت تھی۔اس حالت میں تبدیلی ہوئی اور جسم سڑ گیا یعنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہا۔تعفن کی ایک وجہ ثقل ہے۔

③ جسم میں ثقل ہے:

ثقل کا تعلق مٹھاس اور نمک سے ہے۔ایک میں چپک زیادہ اور دوسری میں کم ہے۔چپک فرد کو ماحول سے نکلنے نہیں دیتی اور ذہن کو بھاری کر دیتی ہے۔ذہن بھاری ہونے سے رفتار کم ہو کر بالآخر جمود بن جاتی ہے۔

④ جسم کی ایک خصوصیت جمود ہے:

جمود کے معنی ''انا'' یعنی خول میں بند رہنا ہے۔نئے نئے خیالات اور خیالات میں نئی نئی دنیاؤں کو قبول نہ کرنے سے فرد خول (الوژن) میں مزید بند ہو جاتا ہے۔

مضمون کی طوالت کے پیش نظر جسم کے چند خواص بیان کئے گئے ہیں۔بتانا یہ ہے کہ جسم کی طرف متوجہ ہونے سے یہ سب چیزیں سوچ میں شامل ہو جاتی ہیں۔تعفن، تغیر، ثقل، جمود، خول میں بند رہنا وغیرہ جیسی منفی صفات میں پھنس کر سوچ پیچیدہ اور فرد امراض کا شکار ہو کر بیماریوں کے لئے لقمۂ تر بن جاتا ہے۔

بیماری کی ابتدا منفی سوچ سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے ذہن منتشر ہو جاتا ہے اور خیالات میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔طرح طرح کی بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں۔عموماً بیماریوں کا علاج دوائیوں سے کیا جاتا ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ دوائیاں بے اثر ہو جاتی ہیں۔وجہ یہ ہے کہ بیماری کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی۔

باطنی علوم کے ماہرین فرد کو ذہنی اور جسمانی امراض سے نکالنے کے لئے توجہ تبدیل کرتے ہیں۔ذہن جب منفی سوچ پر رکتا ہے تو خیالات کثیف ہو جاتے ہیں۔علمائے باطن سوچ کا رخ بدل کر فرد کو قدرت کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات انتشار، شک، خوف اور بے یقینی سے پاک ہے۔غیر متغیر ہستی کی طرف متوجہ ہونے سے فرد تغیر سے دور ہوتا ہے اور صحت یابی کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک بار محمود غزنوی بیمار ہو گیا۔بیماری نے طوالت اختیار کی اور ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔مملکت کے معروف طبیب اپنی کوشش کر چکے اور ناکامی پر تشویش میں مبتلا تھے۔بادشاہ صحت یاب نہ ہو سکا۔بالآخر ایک روز محل میں دانا طبیب آیا۔اس نے بادشاہ کو دیکھ کر وزرا سے کہا، طول وعرض میں اعلان کر دیا جائے کہ محمود غزنوی صحت یاب ہو گیا ہے۔

وزرا حیران ہوئے لیکن طبیب کے مشورہ پر عمل کیا۔اعلان ہوا کہ مبارک ہو، بادشاہ محمود غزنوی اب روبہ صحت ہیں۔شادیانے بجائے گئے اور خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔رعایا نے خوشی کا اظہار کیا۔

البتہ اسی مملکت کے ایک حصہ میں ایک ساتھ بیٹھے چند عاملوں کے کان میں جب یہ خبر پڑی تو ان کا ارتکاز

ٹوٹ گیا۔صحت یابی کا سن کر عاملوں کے ذہن میں شک پیدا ہوا جس سے عمل کی تاثیر ختم ہوگئی۔

دراصل عاملوں نے ارتکاز کے علم کو استعمال کرتے ہوئے محمود غزنوی کو ماورائی طور پر یہ اطلاع دینا شروع کی کہ وہ بیمار ہے۔محمود کا ذہن چوں کہ یقین سے واقف نہیں تھا اس لئے اس کے لاشعور نے اس اطلاع کو قبول کیا اور بیمار ہوگیا۔ ہر زبان پر ایک ہی بات تھی کہ بادشاہ بیمار ہے۔علالت کی خبر کی تکرار ہونے سے بیماری نے طول پکڑلی اور کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر ایک دانا نے سب سے پہلے اس تکرار کو توڑا کہ بادشاہ بیمار ہے۔ اب ہر طرف صحت یابی کی تکرار ہوگئی۔

قانون: ارادہ کی تکرار سے شے مظہر بنتی ہے۔

زندگی کی ابتدا خیال سے ہوتی ہے اور خیال کے علم کا تعلق پیرا سائیکالوجی سے ہے۔ چوں کہ یک سوئی اور انتشار سے آدمی صحت مند یا بیمار ہوتا ہے اسی لئے پیرا سائیکالوجی میں علاج کے لئے مسئلہ کی بنیاد کو تلاش کر کے مریض کی توجہ تبدیل کی جاتی ہے۔

اس وقت دنیا میں مایوسی عام ہے۔نیند کی ادویات یا ذہن کو سست کرنے کی دوائیاں استعمال کرنے سے مریض ٹھیک نہیں ہوتا۔ وقتی طور پر مریض پر نیند غالب آجاتی ہے اور مریض مغلوب ہوجاتا ہے لیکن بیدار ہونے کے بعد مرض بھی بیدار ہوجاتا ہے۔

طویل المدت علاج یہ ہے سوچنے کے زاویہ کو تبدیل کریں۔زاویہ تبدیل ہونے سے مایوسی ختم ہوگی۔

ایک سادھو خواجہ غریب نوازؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ گیان دھیان سے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں گوشت پوست کا جسم مٹی نظر آتا ہے۔جب نظر میں مٹی کے ذرّات تحلیل ہوتے ہیں تو آدمی کے اوپر ایک اور جسم نظر آتا ہے جیسے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر متحرک تصویر۔یہی وہ آدمی ہے جو نسمہ کا ہیولیٰ کہلاتا ہے۔

سادھو نے خواجہ غریب نوازؒ کی طرف گہری نظر ڈالی اس کی نیم وا آنکھیں ان پر جم گئیں اور وہ برملا پکار اٹھا۔

''پربھو، دھن دھن قدرت تیری! جے جے ایشور کی کرپا ہے۔اے خواجہ! تیری آتما روشن ہے لیکن دل میں سیاہ دھبا ہے۔''

سلطان الہندؒ نے فرمایا،''تو سچ کہتا ہے۔''

سادھو یہ سن کر حیرت سے بولا،''چاند کی طرح روشن آتما پر یہ دھبا اچھا نہیں لگتا۔ کیا میری شکتی سے یہ دھبا دور ہوسکتا ہے؟''

خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا،''ہاں تو چاہے تو یہ سیاہی دھل سکتی ہے۔'' سادھو کے اوپر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔اس نے نم آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہا،''میری زندگی آپ کی نذر ہے۔''

خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا،''اگر تو اللہ کے رسول حضرت محمدؐ پر ایمان لے آئے تو یہ دھبا ختم ہوجائے گا۔''

سادھو کی سمجھ میں بات نہیں آئی لیکن چوں کہ اس

کے اندر مٹی کی کثافت ڈھل چکی تھی اس لئے حضرت محمدؐ کی رسالت پر ایمان لے آیا۔

آپ نے فرمایا،''آتما کی آنکھ سے دوبارہ دیکھ۔''

سادھو نے دیکھا تو روشن روشن دل سیاہ دھبے سے پاک تھا۔ سادھو نے سلطان الہندؒ کے آگے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی ،''انہونی سے پردہ اٹھایئے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا'' خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا،

''سن! وہ روشن آدمی جس کے سینہ پر تو نے سیاہ رنگ کا دھبا دیکھا تھا تو خود تھا لیکن اتنی شکتی کے بعد بھی تجھے اپنا ادراک نہیں ہوا۔ ادراک یہ ہے کہ آدمی کا دل آئینہ ہوتا ہے اور ہر دوسرے آدمی کے آئینہ میں اسے اپنا عکس نظر آتا ہے۔ تو نے اپنی روشن آتما میرے اندر دیکھی تو تجھے اپنا عکس نظر آیا۔ تیرا ایمان توحید پر نہیں تھا اس لئے تیرے دل پر سیاہ دھبا تھا اور جب تو نے کلمہ پڑھ لیا، سیاہ دھبا دھل گیا اور تجھے میرے آئینہ پر اپنا عکس روشن اور منور نظر آیا۔''

حضرت معین الدین چشتی المعروف خواجہ غریب نوازؒ نے سادھو کا نقص دور کرنے کے لئے اس کی فکر کی سمت تبدیل کی کہ جو نقص تمہیں میرے اندر نظر آ رہا ہے وہ میرا نہیں، تمہارا عکس ہے لہٰذا اپنے اندر دیکھو۔ اس طرح سادھو کے دل کا آئینہ صیقل ہو گیا۔

صاحبِ علم لدنی حضرت نانا تاج الدینؒ کے ایک شاگرد فریدالدین کریم بابا واقعہ بیان کرتے ہیں،

''جھانسی سے ایک صوفی صاحب بابا تاج الدینؒ سے ملاقات کے لئے شکردرہ آئے۔ صوفی صاحب کا قیام میرے ساتھ تھا اور ہم دونوں میں ہر وقت تصوف اور روحانیت پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے شاہ صاحب سے پوچھا، کیا کوئی آسان طریقہ ہے کہ مجھ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ عرفان کی منزل تیزی سے عبور کرلوں۔ شاہ صاحب نے ایک عمل بتایا اور کہا کہ عمل قبرستان میں کرو۔ جذبۂ شوق سے مغلوب قبرستان جا کر عمل کرنے لگا۔ تیسرے روز عمل میں مشغول تھا کہ محسوس ہوا بابا صاحبؒ کی خفگی میں ڈوبی آواز پکار رہی ہے۔ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا، بابا صاحبؒ دکھائی نہ دیئے۔ دوبارہ عمل میں مصروف ہو گیا۔ بابا صاحبؒ کی غصہ بھری آواز آئی گویا منع فرما رہے ہوں۔ میں اٹھا اور ان کی نشست گاہ کا رخ کیا۔ رات کے تین بجے تھے۔ دیکھتے ہی فرمایا،''کیوں رے! کون بولا بڑے بڑے پہاڑاں کھودنے کو۔ یہ ماچس لے!''

ماچس پکڑاتے ہوئے فرمایا،''کاہے کو ادھر ادھر ڈھونڈتا ہے۔'' پھر آپ نے کچھ الفاظ ادا کئے جو سمجھ میں نہیں آئے۔ دل میں عرض کیا،''حضور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے کیا فرمایا ہے۔''

خیال آتے ہی بابا صاحبؒ نے طمانچہ مارا اور فرمایا،

''ذہن چراتا ہے!''

انہوں نے وہاں موجود ایک شخص کے کندھے سے شال لے کر ایک پلو میرے ہاتھ میں دیا اور دوسرا خود

پکڑ کر فرمایا، ''بچھا! یہ ہے دکان۔''

فریدالدین کریم بابا فرماتے ہیں کہ جب بابا صاحبؒ نے مجھے ماچس دی تو ذہن میں یہ بات آئی کہ جس طرح ماچس کی تیلی میں شعلۂ نور چھپا ہوا ہے اسی طرح اللہ کا نور میرے اندر موجود ہے۔ اللہ کو رگِ جاں سے اقرب ہونے کے باوجود ادھر ادھر ڈھونڈنا اور خود سے الگ سمجھنا لاحاصل ہے۔ جب انسان خود کو پہچان لیتا ہے تو اس ہستی کا عرفان حاصل کر لیتا ہے جس نے خود کو متعارف کروانے کے لئے کائنات کو وجود کا لباس پہنایا ہے۔

غور طلب لفظ ''ذہن چرانا'' ہے جو پورے واقعہ پر محیط ہے۔ ذہن چرانے کا مطلب اپنا ذہن استعمال کرنا ہے یعنی فطرت کے برخلاف عمل۔ بابا کریم نے ناسمجھی میں مرشد کے ہوتے ہوئے دوسرے سے رجوع کیا۔ جب کہ مرشد شاگرد کی افتادِ طبع سے واقف ہوتا ہے اور اسی کے مطابق تربیت کرتا ہے۔

بابا تاج الدینؒ نے ان کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا، ''ذہن چراتا ہے!''

سبق یہ ہے کہ اصل سے ذہن ہٹ جائے تو نقصان ہوتا ہے۔ غلطی کا ادراک ہونے سے مرشد کی بات کا مفہوم ذہن میں کھل گیا۔ مابعدالنفسیات یا روحانیت کا علم بندہ کو اصل سے رجوع کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

(قسط: ۳)

تقویم کا راز

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانہ کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

(کلام: شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ)

منظور احمد

دل پذیر ــــ پھول

نباتاتی دنیا میں رنگ نہ ہوتے تو کیا آدمی اور حیوان میں رنگینی ہوتی ــــ؟

عام تصور ہے کہ پھول صرف خوش بو اور رعنائی کے لئے ہیں۔کیا آپ جانتے ہیں کہ ان کی تخلیق کا مقصد نوع نباتات کی بقا ہے۔ایک مثال آبی پودے والیسنیر یا سپائریلیا کی ہے۔اس پودے پر لگنے والے مادہ پھول ڈالیوں سمیت پانی کی سطح پر آجاتے ہیں۔ جب نر پھول کے زیردانے سطح آب پر آتے ہیں تو دونوں کے ملنے کے بعد مادہ پھول کی ڈالیاں سمٹ کر پانی کے اندر چلی جاتی ہیں، جہاں بیج تیار ہوتا ہے۔ ڈالیوں کی یہ تگ و دو اس پودے کی نسل قائم رکھنے کے لئے ہے۔

پھولوں کی ساخت سے متعلق قابل غور ہے کہ اکثر نر و مادہ کے زیردانے دونوں ایک پھول میں ہوتے ہیں۔لہٰذا ممکن ہے کہ وہ اپنے ہی زیردانوں سے بارآور ہوں۔تاہم بہتر ہے کہ بارآوری کسی اور پھول کے زیردانوں سے ہو کیوں کہ دو مختلف پھولوں کا مواد اکٹھا ہونے سے عمدہ بیج پیدا ہوتا ہے۔

بارآوری ہوا، پانی، کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں کی مدد سے انجام پاتی ہے۔ہوا کے ذریعے بارآور ہونے والے پھولوں میں رنگ و بو اور رس نہیں ہوتا۔اس قسم کے پھول پنکھڑیوں کے بغیر ہوتے ہیں یا مخروطی شکل میں ہوا میں الٹے لٹکے رہتے ہیں۔

وہ پھول بھی اس زمرہ میں شامل ہیں جن کے اردگرد غلاف ہوتا ہے لیکن بارآوری ہوا کے ذریعے ہوتی ہے۔ مثلاً گھاس خاندان (Graminae) کے پھول یا بید مجنوں (Willows) اور بھوج پتر یعنی Birch کے ایسے پھول جن میں لچک دار ڈالیاں ہوتی ہیں اور زیردانے بکثرت پائے جاتے ہیں جس کو ہوا دور تک غبار کی شکل میں پھیلا دیتی ہے۔

وہ پودے جو کیڑے مکوڑوں کے ذریعے بارآور ہوتے ہیں ان کا نظام بھی مخصوص ہے۔پھولوں کی مہک اور رنگینی سے کیڑے ان تک پہنچتے ہیں اور رس چوس کر غذا حاصل کرتے ہیں۔شہد کی مکھیاں رس چوستے ہوئے پھول کے زیردانوں سے آلودہ ہو جاتی ہیں۔ جب یہ دوسرے پھول پر رس کی تلاش میں پہنچتی ہیں تو زیردانے ان کی بیضہ دانی میں پہنچاتی ہیں۔شہد کی

مکھیاں بار بار پھولوں پر جاتی ہیں اور اس طرح پودوں کی نسل کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

محققین کے مطابق پھولوں اور کیڑوں کی باہمی ضروریات کی وجہ سے مدت دراز کے بعد پھولوں کی ساخت اور کیڑوں کے اجسام میں گہرا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ پھولوں کی وضع اور ساخت میں بعض ایسی تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں کہ جن سے دوسرے کیڑے ایسے پھولوں کے قریب نہیں آتے جب کہ پھولوں سے مطابقت رکھنے والے کیڑے ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پھولوں کی ساخت میں قدرت نے ایسی ترکیبیں پیدا کی ہیں کہ جب کیڑا رس لینے آتا ہے تو رس دان تک پہنچتے پہنچتے وہ زیردانوں سے آلودہ ہوجاتا ہے۔ جب دوسرے پھول کی بیضہ دانی تک پہنچتا ہے تو وہاں بارآوری کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بعض قلفی نما پھولوں میں بال اس طرح آگے ہوتے ہیں کہ داخل ہونے والا کیڑا اس وقت تک باہر نہیں آسکتا جب تک وہ زیردانوں سے رگڑ نہ کھائے۔

بعض پھولوں کی ساخت ایسی ہے کہ ان میں غیر مطلوب کیڑا داخل نہیں ہوسکتا خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کرے۔ مثلاً آرکڈ خاندان (Orchid family) میں ایسے پھول ہیں جن میں رس دان تقریباً ایک فٹ گہرے ہوتے ہیں۔ چناں چہ رس تک پہنچنے میں وہی کیڑے کام یاب ہوسکتے ہیں جن کی تھوتھنی لمبی ہوتی ہے۔ کیڑے کی تھوتھنی پھول سے مس کرتی ہے تو پھول یک دم نیم وا اور کیڑے کا جسم زیردانوں سے آلودہ ہوجاتا ہے۔

ان ترکیبوں کا ایک مقصد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کم سے کم زیردانوں سے زیادہ سے زیادہ بارآوری ہو۔ ہوا کے ذریعہ بارآور ہونے والے پھولوں میں ضروری ہے کہ ان کے زیردانے ہوا میں بکثرت پھیل جائیں۔ مگر جن پھولوں میں بارآوری کیڑوں کے ذریعہ انجام پاتی ہیں وہاں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا ہے۔

جب کوئی شے سخت تگ و دو اور کاوش سے حاصل ہو تو اسے یوں ہی خرچ کر دینا مناسب نہیں۔ کفایت شعاری سے کام نہ لینے والے پھول رفتہ رفتہ کم ہوجاتے ہیں۔ برخلاف ان پھولوں کے جو کفایت شعار ہیں — ان کی نسل نہ صرف مضبوط بلکہ حسین اور دل پذیر ہوتی ہے۔

پھولوں کی مہک اور رنگینی نے شاعری پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ شاعری میں آنکھ کو نرگس سے، زبان کو سوسن سے اور عارض (گال) کو گل لالہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ پھولوں کی بوقلمونی سے احساسات و جذبات میں لطافت ہے۔ نباتاتی دنیا میں رنگ نہ ہوتے تو آدمی اور حیوان میں رنگ و روپ نہ ہوتا۔ سب کی بنیادی خوراک نباتات ہیں۔

مُرشد کی باتیں

میخانہ میں آملک سلیماں یہ ہے
شیشہ ہے پیالہ ہے شبستاں یہ ہے
معلوم نہیں سبا کی ملکہ کیا تھی
ساقی پہ نگاہ رکھ چراغاں یہ ہے

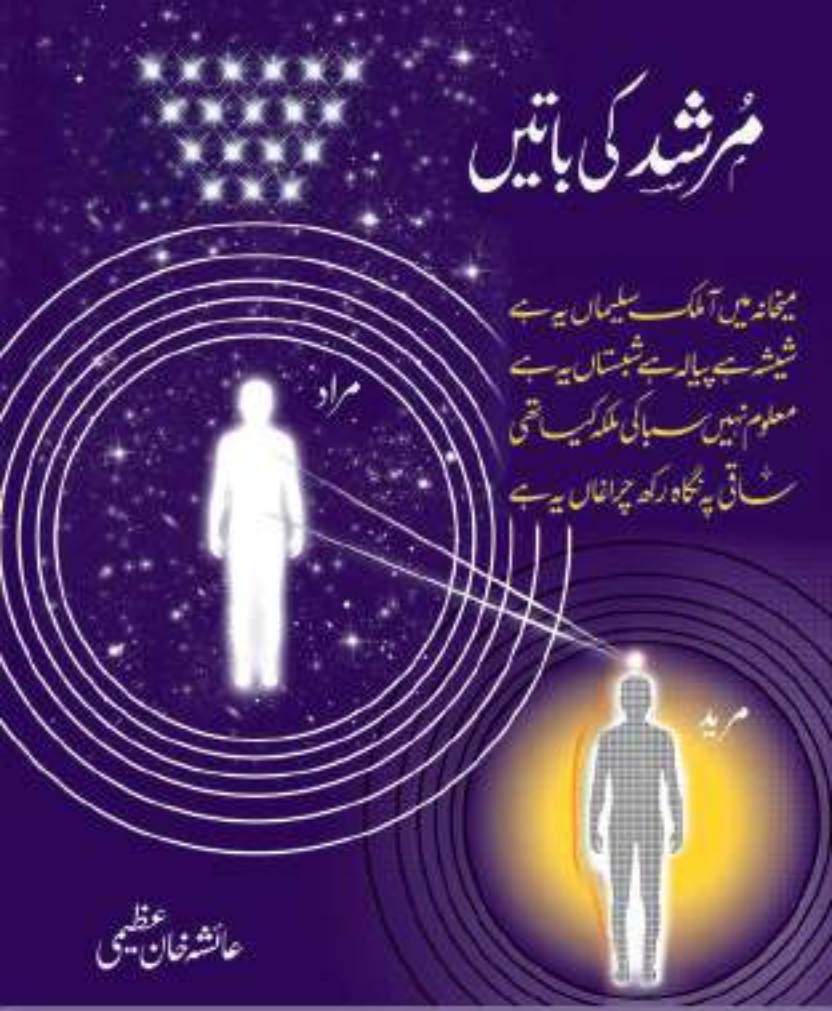

عائشہ خان عظیمی

''ماہنامہ قلندر شعور'' میں شائع ہونے والا مقبول و معروف سلسلہ
''مرشد کی باتیں'' کتابی صورت میں دستیاب ہے۔

ملنے کا پتہ:

عظیمی یونیورسٹی پریس
AZEEMI UNIVERSITY PRESS
B-123, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town, Karachi, Pakistan.
Tel: +92-21-36914040, Cell: +92-346-8553904

ن ق ط ہ ـــ ؟

قلندر شعور فاؤنڈیشن کے تحت اگست میں منائے جانے والے ''آدم ڈے'' پر خصوصی تحریر

ہم سب بابا آدمؑ اور اماں حواؑ کی اولاد ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کا سلسلہ نسل در نسل زمین پر پہلے جوڑے (آدمؑ و حواؑ) تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم خود کو نظر کے سامنے اور یادداشت میں محفوظ رشتوں تک محدود رکھتے ہیں اس لئے بحیثیت نوع آدم — ایک خاندان سمجھنے کے بجائے خود کو ایک دوسرے سے الگ دیکھتے ہیں۔ انفرادی سوچ نے ایک ماں باپ سے پیدا ہونے کے باوجود سب کو تقسیم کر دیا ہے۔

غور طلب ہے کہ ہر قوم پر نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں۔ سارے پیغمبروں نے مشترکہ طور پر نوع آدم کو اچھائی اور برائی کے تصور سے آگاہ کیا ہے، عبادت کے لئے اللہ وحدہٗ لاشریک کا تعارف کروایا ہے، بتایا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق میں بھائی چارا چاہتا ہے، مخلوق کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور اللہ کو ناخوشی پسند نہیں۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو بتایا کہ میں ایک ہی پیغام کا تسلسل ہوں جو مجھ سے پہلے میرے بھائی انبیا نے اپنی امتوں کو دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمدؐ سے فرمایا،

''اے نبیؐ! تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔'' (حٰمٓ السجدۃ: ۴۳)

توریت میں ہے،

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی پیدا کرے گا تم اس کی سننا۔'' (استثنا: باب ۱۸، آیت ۱۵)

کائنات تخلیق کرنے والی ہستی ایک ہے۔ شروع سے آخر تک پیغام بھی ایک ہے۔ پیغام کے تعارف کے لئے وسائل بھی ایک ہیں۔ وسائل کی موجودگی کی خبر اور وجود میں حرکت کا ذریعہ یعنی اطلاع بھی ایک ہے۔ سب کسی نہ کسی نبی کی تعلیمات کو مانتے ہیں اور انبیائے کرام کی تعلیمات ایک ہیں لیکن پیروکاروں میں اتفاق نہیں!

وجہ یہ ہے کہ ہم الہامی کتابوں کی روح سے ناواقف ہیں۔ انبیائے کرام کی تعلیمات کو چھوڑ کر اتحاد کے بجائے ذاتی مفاد کے پیش نظر خود ساختہ اختلافات کو اہمیت دے دی ہے۔

دنیا اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے اس میں نا اتفاقی اور بے سکونی عروج پر ہے۔ آدمؑ و حواؑ کی اولاد ایک دوسرے کی دشمن بن گئی ہے۔

سکون و آشتی ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوئے بغیر ممکن نہیں اور وہ پلیٹ فارم یہ ہے کہ ہم ایک ماں اور ایک باپ — بابا آدمؑ اور بی بی حوّا کی اولاد ہیں اور ہمارے ماں باپ کا ورثہ کائناتی فارمولوں (تخلیقی قوانین) کا علم ہے۔

ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے نوع آدم کو سکون سے آشنا کیا ہے۔ انبیائے کرام کے بعد ان کے روحانی علوم کے وارث اولیاء اللہ (اللہ کے دوست) نے لوگوں کو اللہ کی ذات کی طرف متوجہ کیا۔

بین المذاہب ہم آہنگی اور نوع آدم کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کی ایک کوشش ''آدم ڈے'' ہے جس کا پہلی بار انعقاد اللہ کے ایک دوست نے 2003ء میں کیا۔ خلق خدا کو باطنی علوم کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ سکون سے آشنا کرنے کی ان کی کاوشیں کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ ان کے اس اقدام کو بلاتفریق مذہب و ملت سب نے سراہا ہے اور اب ''آدم ڈے'' باقاعدگی سے قلندر شعور فاؤنڈیشن کے تحت ہر سال 10 اگست کو برطانیہ، امریکا، کینیڈا، روس سمیت دنیا کے بیش تر ممالک میں منایا جاتا ہے۔

سال 2019ء میں ''آدم ڈے'' کا مرکزی خیال اطلاع اور اس کے مدارج یعنی نقطہ میں خدوخال ہیں۔

آیئے اس فارمولے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اطلاع کے نظام سے واقف ہو کر نوع آدم کس طرح ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو سکتی ہے۔

◉

سطحی نظر — حقیقت سے ناواقفیت اور قیاس کا نتیجہ ہے۔ قیاس پر زندگی گزارنے سے فرد سمجھتا ہے کہ دنیا کی وسعت حد نظر کے مطابق ہے — لیکن عجائبات سے بھرپور یہ کائنات غور و فکر کرنے والوں پر رمز افشا کرتی ہے کہ عالم رنگ و بو کے علاوہ چمن و آشیاں اور بھی ہیں — اور ہر عالم میں خدوخال کی حیثیت ثانوی ہے۔

ہر نظر آنے والی شے کا پس منظر ہے۔ خدوخال کے پیچھے رنگ ہیں اور رنگوں کے پس پردہ روشنی ہے۔ روشنی نور پر قائم ہے۔ نور بنیاد ہے جس میں کائناتی خدوخال مغلوب ہو جاتے ہیں اور اسپیس سمٹ کر نقطہ میں آجاتی ہے۔ پھر اسی نقطہ سے حرکت کا آغاز ہوتا ہے اور سمٹی ہوئی اسپیس ایک بار پھر پھیلتی ہے جس کو ہم کائنات کہتے ہیں۔

نقطہ کا پھیلنا اور سمٹنا کیا ہے —؟ پھیلنے سے رنگ غالب ہوتے ہیں اور اشیا میں دوری پیدا ہوتی ہے جب کہ سمٹنے سے رنگ مغلوب ہو جاتے ہیں اور اشیا

کی بنیاد نمایاں ہوتی ہے۔ پھیلنے اور سمٹنے کا میکانزم جس عمل کے تابع ہے، وہ اطلاع ہے۔

کائنات کو سمجھنے کے لئے اطلاع سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اطلاع کیا ہے ــــ؟

''ذہن کی دنیا پر غور کریں۔ وہاں تصویروں کے علاوہ کچھ نہیں۔ تصویریں سنتی ہیں، دیکھتی ہیں، سمجھتی ہیں، محسوس کرتی ہیں، بات کرتی ہیں اور اندر میں بھی دیکھتی ہیں لیکن کیا ذہن کی دنیا میں موجود حرکت تصویروں کی ہے؟ تصویروں کو حرکت کون دیتا ہے؟''

کائنات اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود پروگرام کا عکس ہے۔ عکس میں تحریک روح سے پیدا ہوتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ روح کی صلاحیت کے اظہار کا ایک ذریعہ اطلاع ہے۔

روز ازل میں ''الست بربکم'' سے پہلے مخلوقات کو اپنی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ خالق کائنات نے تخلیقات سے فرمایا ــــ الست بربکم!

پہلے سماعت متحرک ہوئی پھر بصارت، ادراک، احساس اور گویائی کا مظاہرہ ہوا۔ تخلیقات نے عرض کیا، جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔

اطلاع آواز ہے اور آواز ایک ہے۔ آواز شعور کی سکت کے مطابق نزول کرتی ہے اور ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی ہے یعنی سماعت، بصارت، ادراک، احساس اور گویائی وغیرہ۔ اطلاع کے ایک نقطہ میں سمٹنے اور تقسیم ہونے کو فلم پروجیکٹر کی مثال سے سمجھئے۔

پروجیکٹر سے روشنی نکل کر فلم کی ریل پر سے گزرتی ہے۔ پھر تیز بیم کی صورت میں سنیما کی چھت پر بنے چھوٹے سوراخ سے گزر کر اسکرین پر پھیلتی ہے۔ اسکرین پر پھیلنے والی روشنی ایک ہے، روشنی میں مختلف مقداریں ہیں۔

جس سوراخ سے روشنی سنیما ہال میں داخل ہوتی ہے اس مقام کو غور سے دیکھا جائے تو روشنی شعاعوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ شعاعیں طول موج ہیں اور طول موج دراصل تصویریں ہیں۔ شعاعیں اسکرین پر پھیلنے سے تصویریں ظاہر ہوتی ہیں۔

ہر اطلاع ایک علم ہے اور علم کے مدارج* ہیں۔

۱۔ علم ظاہر ہونے کی پہلی حالت ادراک ہے۔

۲۔ ادراک میں گہرائی نگاہ ہے۔

۳۔ ذہن پر شبیہ کا ہلکا سا عکس پڑتا ہے ــــ خدوخال واضح ہوتے ہیں۔

۴۔ خدوخال واضح ہوتے ہیں اور شبیہ گویا ہوتی ہے، بولتی، سنتی، دیکھتی، چلتی پھرتی ہے۔

۵۔ لہروں میں دیکھنا اور محسوس کرنا ــــ شبیہ کو چھونا ہے۔

۶۔ شبیہ کو چھونا اور دیکھنا شعور ہے۔

---

* ان نکات کو سمجھنے کے لئے ''آدم ڈے'' کا backdrop دیکھئے۔

۷۔شعور کی مرکزیت لہریں ہیں۔

گندم کھانے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ تقاضے کی طرف متوجہ ہونا — ادراک ہے۔ متوجہ ہونے سے یادداشت میں "گندم" آواز (خیال) آجاتی ہے مگر تصویر نہیں بنتی — یہ نگاہ کی دنیا ہے جو ابھی فرد کے اندر بیدار نہیں ہوئی۔ ذہن میں شے ہے لیکن فرد اس کو نہیں دیکھ رہا۔ اگلے مرحلہ پر ذہن یک سو ہونے سے گندم کی شبیہ کا عکس پڑتا ہے۔

غور کیجئے کہ نہ گندم اور نہ شبیہ — بلکہ شبیہ کا عکس!

آہستہ آہستہ رنگ واضح ہوتے ہیں اور فرد ان رنگوں کو ٹھوس دیکھتا ہے۔ گندم کی شبیہ ذہن سے باہر نہیں آتی — اندر ہے۔

گندم کی طرح فرد بھی اطلاع ہے اور لہروں پر قائم ہے۔لہریں — لہروں کو دیکھتی ہیں۔لہریں دراصل اشیا ہیں۔ شے لہروں میں آتی ہے اور لہروں میں واپس چلی جاتی ہے۔سنیما میں بیٹھا ہوا فرد جب لہروں میں خود کو محو کر دیتا ہے تو اشیا میں ٹھوس پن محسوس کرتا ہے۔ کرداروں کو دیکھ کر ہنستا اور روتا ہے۔ شے کتنے ہی رنگوں میں ظاہر کیوں نہ ہو — مرکزیت لہریں ہیں۔

سوال ہے کہ جب سب کچھ تصویریں ہیں اور تصویریں ساکن ہوتی ہیں پھر اسکرین پر ان کا حرکت میں نظر آنا کیا ہے—؟

فلم میں ہم کرداروں کو چلتا پھرتا دیکھتے ہیں جب کہ کردار ریل پر نقش تصویریں ہیں۔ ہر تصویر ساکن ہے۔فلم کے معنی تصویروں کو ترتیب سے روانی میں دکھانا ہے۔ اس سے کرداروں کے حرکت میں رہنے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ گمان مفروضہ ہے جو حرکت کو کرداروں سے منسلک کر دیتا ہے۔ جب کہ حرکت کرداروں کی نہیں، اس پلیٹ کی ہے جو ان تصویروں کو تیزی سے چلا رہی ہے۔

کیمرے میں فی سیکنڈ فریموں کی تعداد ٹیکنالوجی کی مناسبت سے مختلف ہے۔ اوسط مقدار فی سیکنڈ 24 مقرر کر لی جائے تو مطلب یہ ہے کہ 24 تصویروں کو

تیزی سے چلایا جائے تو ایک سیکنڈ کی حرکت ظاہر ہوتی ہے۔مثال کو مدنظر رکھ کر زندگی کا موازنہ کیجئے اور بتایئے کہ زندگی کیا ہوئی — ؟

کائنات ریکارڈ شدہ فلم ہے۔ ہر موجود شے کُن کے ساتھ وجود میں آچکی ہے۔اور اب اطلاع کے ذریعے ہر عالم میں اسکرین پر ظاہر ہو رہی ہے۔

اطلاع سے ڈائی مینشن واضح ہوتے ہیں اور اطلاع ہی کے ذریعے فرد اسپیس (ڈائی مینشن) کو مغلوب کر کے نقطہ میں داخل ہوتا ہے۔ارشاد باری ہے،

''لوگو اپنے رب کے لئے تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔'' (النسآء: ۱)

کائنات محبت سے تخلیق کی گئی ہے تاکہ مخلوق اللہ کا عرفان حاصل کرے۔ ہر نبی اور رسول نے اپنی قوم کو ایک ہی اطلاع دی کہ

اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں،

اسی کی بندگی کرو تاکہ تمہارا شمار صالحین میں ہو۔

ہم سب کے جد امجد بابا آدمؑ کی تعلیمات کے بعد حضرت نوحؑ سے لے کر آخری نبی حضرت محمدؐ نے اپنی امت پر یہ واضح کیا کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا بلکہ اس اطلاع کا تسلسل ہوں جو مجھ سے پہلے ہدایت دینے والوں نے دی۔

اللہ ایک ہے — اللہ کا پیغام بھی ایک ہے۔انبیائے کرام کی بعثت کے ادوار الگ الگ ہیں جس کی وجہ سے ہر دور کی زبان میں فرق ہے۔لیکن زبان بدلنے سے معنی و مفہوم تبدیل نہیں ہوتے۔ پیاس کی اطلاع ملتی ہے تو پانی پینے کا خیال آتا ہے۔ پانی کا نام ہر زبان میں مختلف ہے لیکن پانی ایک ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد باری ہے،

''اللہ سماوات و ارض کا نور ہے۔'' (النور: ۳۵)

رگ وید میں ہے کہ،

''اس وقت عدم تھا نہ وجود، نہ عالمِ ہوا نہ آسمان۔ کیا چھپا تھا اور کیا ظاہر؟ سائبان کس شے کا تھا؟ سب کچھ پانی ہی پانی تھا۔'' (۱۲۹:۱۰)

توریت میں لکھا ہے،

''خدا نے کہا روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔''

(پیدائش: باب ۱، آیت ۳)

انجیل میں لکھا ہے،

''ابتدا میں کلام تھا، کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔'' (انجیل یوحنا: باب ۱، آیت ۱)

نور — پانی — روشنی — کلام — سب اطلاع کے درجات ہیں۔

سوال: لوح محفوظ سے نور ساری کائنات میں پھیلتا ہے یعنی اطلاع اور سورس ایک ہے۔سوال ہے کہ پھر ہر فرد کی تشریح الگ کیوں ہے — ؟

جواب: اطلاع ــــ انسپائریشن ہے۔ فرد انسپائریشن کو خالص قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے معنی پہنا کر مسخ کر دیتا ہے۔ ماحول سے ملنے والی طرزِ فکر، سوچ میں جانب داری اور الوژن کو حقیقت سمجھنا وہ عوامل ہیں جو لوگوں کو تقسیم کر کے حقیقت سے دور کر دیتے ہیں۔ اطلاع سب کو ملتی ہے، کوئی اسے نفرت کے فلٹر سے گزارتا ہے اور کوئی محبت کی تصویر بن جاتا ہے۔

بابا آدمؑ اور اماں حواؑ کی اولاد کے رشتہ سے زمین کے ایک خطہ پر رہنے والا فرد، زمین کے دوسرے خطہ پر رہنے والے فرد کا بھائی یا بہن ہے۔ آب و ہوا اور مقام کی وجہ سے رنگ و نسل اور زبانیں مختلف ہیں لیکن شجرۂ نسب سب کا ایک ہے۔ ہم کائنات میں فردِ واحد کے علاوہ ایک خاندان ہیں لیکن محدود سوچ کی وجہ سے خود کو ایک نہیں سمجھتے۔

''آدم ڈے'' کے موقع پر مذاہب کے اکابرین اور لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور بحیثیت نوعِ آدم اپنے ابا آدمؑ اور اماں حواؑ کی مشترک اقدار پر تفکر کرتے ہیں تاکہ خود ساختہ اختلافات غیر اہم ہو جائیں، اتفاق پیدا ہو اور دنیا سکون کا گہوارہ بن جائے۔

آسمانی کتابیں اور قرآن کریم میں تفکر سے بندہ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ کر الوژن (تفرقہ) سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اگر نوعِ آدم اطلاع کے نظام سے واقف ہو جائے تو یقیناً ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو سکتی ہے۔

نوعِ آدم کا تشخص

- ہر حال اور ہر قال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔
- چھوٹے اور بڑے کا امتیاز کئے بغیر سلام میں پہل کریں۔
- اللہ کی مخلوق کو دوست رکھیں۔
- نوعِ انسانی میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب آپس میں آدم کے ناتے سے خالقِ کائنات کے تخلیقی راز و نیاز ہیں۔ آپس میں بہن بھائی ہیں۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ بڑائی صرف اس کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اللہ کی صفات کے سمندر کا عرفان رکھتا ہو، جس کے اندر اللہ کے اوصاف کا عکس نمایاں ہو، جو اللہ کی مخلوق کے کام آئے، کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔
- شک کو دل میں جگہ نہ دیں۔ جس فرد کے دل میں شک جاگزیں ہو وہ عارف کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ شک شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ آدم زاد کو اپنی روح سے دور کر دیتا ہے۔ روحانی قدروں سے دوری آدمی کے اوپر علم و آگہی اور عرفان کے دروازے بند کر دیتی ہے۔
- تم اگر کسی کی دل آزادی کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو قطع نظر اس کے کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس لئے کہ جھکنے میں عظمت ہے۔
- تمہیں کسی کی ذات سے تکلیف پہنچ جائے تو اسے بلا توقف معاف کر دو۔ اس لئے کہ انتقام بجائے خود ایک صعوبت ہے۔ انتقام کا جذبہ اعصاب مضمحل کر دیتا ہے۔

حماد علی شاہ

لبیک اللھم لبیک

حج کے ایام شروع ہوئے۔ خطۂ ارض سے لاکھوں عازمین حج کی برکت و رحمت سے مشرف ہونے کے لئے حرم کی سرزمین پر جمع تھے۔ حجاج میں مشہور صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصریؒ بھی تھے۔ عازمین حج کی صداؤں سے مکہ مکرمہ کے دشت و جبل گونج اٹھے۔

زمین پر گہری سیاہ رات جب کہ آسمان ستاروں سے روشن تھا۔ ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔ لوگ گہری نیند سو رہے تھے البتہ ایک شخص عاجزی و انکساری کے ساتھ اللہ کے حضور دعا گو تھا،

''اے خدائے بزرگ و برتر! شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے نعمتوں سے نوازا، کفالت و حفاظت کی اور عبادت کی توفیق عطا فرمائی۔ بیت اللہ کی زیارت کی خواہش ہے۔ اخراجات میں تخفیف کر کے پیسے جمع کئے ہیں لیکن رقم ناکافی ہے۔ غیب سے مدد عطا فرما تا کہ سرفراز ہو جاؤں۔''

اس کے پاس دو اونٹنیاں تھیں۔ ایک اونٹنی گھر کے لئے رکھی اور رقم کے بندوبست کے لئے دوسری کو فروخت کرنے کی کوشش میں تھا۔

صبح دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس سے چند روز پہلے اونٹنی کا سودا طے نہیں ہو سکا تھا۔ سلام کے بعد بولا، میں نے اس روز اونٹنی کی قیمت کم لگائی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ زیادہ تر نر بچہ جنتی ہے لیکن تمہارے ایک عزیز سے ملاقات ہوئی جس نے بتایا کہ اونٹنی نے کل رات مادہ بچہ کو جنا ہے۔ اسی لئے واپس آیا ہوں اور بچہ سمیت اونٹنی خریدنا چاہتا ہوں۔

سفر کے لئے اچھی رقم کا انتظام ہو گیا۔ تیاری شروع کی۔ روانگی کا وقت قریب آیا۔ کل صبح اسے قافلہ کے ہم راہ روانہ ہونا تھا۔ خوشی کی انتہا نہ تھی۔ یہ وقت کئی سال کے انتظار کے بعد آیا تھا۔ مقدس مقامات کی زیارت، ان سے وابستہ واقعات اور خانۂ کعبہ کی پُر نور فضا کے بارے میں سوچ کر بے رونق آنکھوں میں چمک آ گئی، دل میں محبت کی شمع جلنے لگی اور وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔

ابھی چہرہ پر مسکراہٹ کی لکیر موجود تھی کہ چھوٹا بچہ روتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ اس شخص نے بچہ کو پڑوس میں کسی کام سے بھیجا تھا۔

پوچھا کیوں رو رہے ہو؟

بچہ نے بتایا کہ پڑوسی گوشت کھا رہے تھے۔ کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رو دیا۔ بچہ کو سمجھایا کہ رات کو گوشت نہیں ملے گا، صبح انتظام ہو جائے گا۔ لیکن وہ روتا رہا۔

وہ شخص خاموشی سے اٹھا، پڑوسی کے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھلا تو اس نے ناگواری سے کہا، پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن تم کیسے مسلمان ہو کہ یہ بات بھول گئے؟ کیا پڑوسیوں کا یہی حق ہوتا ہے جو تم نے ادا کیا؟ میرا بچہ منہ تکتا رہا اور تم کھانے میں مگن رہے۔ معصوم کو ایک لقمہ دے دیا ہوتا۔ پڑوسیوں کے حقوق کا خیال نہیں تھا تو کم از کم میرے بچہ کو گھر بھیج کر گوشت کھا لیتے۔

پڑوسی نے آہستہ سے کچھ کہا جسے سن کر حج پر جانے والا پڑوسی گہری سوچ میں گم خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔

روانگی میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ چاروں طرف سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سیاہی میں ایک سایہ نظر آیا جو چند قدم چلنے کے بعد غائب ہو گیا۔

صبح محلّہ مسجد سے بلند ہونے والی صدائے تکبیر سے گونج اٹھا۔ عازمین نے رخت سفر باندھا اور قافلہ سے جا ملے۔ قافلہ روانہ ہونے کو تھا۔

دوسری جانب حج پر جانے کی خواہش رکھنے والے شخص کو الوداع کہنے کے لئے گاؤں والے مکان کے گرد جمع تھے لیکن وہ گھر سے نہیں نکلا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی اسے قافلہ والوں تک پہنچانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ چھوٹے بچے بھی موجود تھے لیکن دروازہ بند تھا۔ قافلہ کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا۔

محلّہ والے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے تیزی سے دروازہ بجایا۔ اس بار دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر آیا— فضا مبارک باد کی آواز سے گونج اٹھی۔

کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں رہ گئی۔ بمشکل خود پر قابو پایا اور توانائی یک جا کر کے لوگوں کو بتایا— میں حج پر نہیں جا رہا!

مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا۔ گھر والوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے لیکن وہ شخص مطمئن کھڑا تھا۔ مجمع طرح طرح کی باتیں کرتے ہوئے منتشر ہو گیا۔

حج کے ایام شروع ہوئے۔ خطۂ ارض سے لاکھوں عازمین حج کی برکت و رحمت سے مشرف ہونے کے لئے حرم کی سرزمین پر جمع تھے۔ حجاج میں مشہور صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصریؒ بھی تھے۔ عازمین حج کی صداؤں سے مکہ مکرمہ کے دشت و جبل گونج اٹھے۔

لبیک اللّٰھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک
ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک

ترجمہ: حاضر ہوں یا اللہ میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ آپ کا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ بلاشبہ ہر طرح کی تعریف اور نعمت آپ کی ہے اور بادشاہت

بھی۔آپ کا کوئی شریک نہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے آواز سنی،

''اس سال کسی کا حج قبول نہیں ہوا۔''

ہاتف غیبی کی صدا سن کر حضرت ذوالنون مصریؒ چونک گئے۔حیرت ہوئی اور بات بھی حیرت کی تھی۔ لاکھوں کے جم غفیر میں کیا ایک شخص بھی اس قابل نہیں کہ اس کا حج قبول کیا جاتا—؟

کشمکش میں تھے کہ ایک بار پھر صدا آئی،

''اس سال احمد بن اسکاف دمشقی نے حج کی نیت کی،لیکن وہ نہ آسکا۔ہم نے اسے حجِ اکبر کا ثواب عطا کیا ہے اور دوسرے حجاج کا حج اس کے سبب قبول فرمایا ہے۔''

حضرت ذوالنون مصریؒ حیران ہوئے کہ احمد بن اسکاف دمشقی کون ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کی کون سی ادا پسند آئی جو اس قدر فضل وکرم ہوا۔مناسک حج کی ادائیگی کے بعد دمشق جانے کا فیصلہ کیا۔

روایت ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ ہفتوں کی مسافت کے بعد احمد بن اسکاف کے گھر پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔دروازہ پر اجنبی کو دیکھ کر احمد بن اسکاف نے آنے کا سبب پوچھا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ سے حج کی ادائیگی کے بعد آرہا ہوں۔سنا ہے تم نے حج کا ارادہ کیا تھا لیکن نہیں جاسکے؟

احمد بن اسکاف نے پوچھا کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچے اور میرے بارے میں کس نے بتایا—؟

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا، لاکھوں افراد کے مجمع میں تمہارا نام سنا۔ہاتف غیبی نے کہا کہ تمہارے صدقے سب کا حج قبول کرلیا گیا ہے۔مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیت اور عمل کو قبول فرمایا اور حجِ اکبر کا ثواب عطا فرمایا ہے۔

احمد بن اسکاف یہ سن کر رونے لگا اور بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا۔

حضرت ذوالنونؒ نے پوچھا کہ کس سبب سے تم حج پر نہیں جاسکے؟ اس نے واقعہ سنایا،

حج پر جانے سے ایک روز قبل چھوٹا بیٹا روتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔پڑوس کے گھر میں گوشت دیکھا تھا، وہ گوشت کھانا چاہتا تھا لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا۔ میں پڑوسی کے طرز عمل سے رنجیدہ ہوا اور اس کے گھر گیا۔اسے حقوق العباد یاد دلائے تو وہ قریب آیا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور چہرہ افلاس کی تصویر تھا۔ صحن میں چٹائی پر اس کے زرد چہرہ کم زور بچے کھانا کھانے کے بعد میٹھی نیند سو رہے تھے۔

پڑوسی نے جو بات بتائی—پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔اس نے کہا، ہائے افسوس! راز فاش ہوگیا۔پانچ دن سے گھر والے بھوک سے بے حال تھے لیکن میری خودداری نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روک دیا۔نوبت ہلاکت تک پہنچی تو میں

جنگل کی طرف نکل گیا۔ مردہ بکری نظر آئی۔ گوشت لیا اور اسی کو ابال کر ہم کھا رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ تمہارے بچے سے نہیں پوچھا۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ہم گوشت کھائیں اور پڑوسی منہ تکتا رہے؟

احمد بن اسکاف نے بتایا کہ پڑوسی کی بات سن کر مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ خاموشی سے گھر واپس آیا۔ بار بار خود سے کہتا کہ اے احمد بن اسکاف! تجھ پر افسوس ہے کہ تیرے گھر میں ہزاروں درہم و دینار ہوں اور ہمسایہ فاقے کر رہا ہو۔ قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھائے گا اور تیرا حج کیسے قبول ہوگا—؟ سخت ندامت ہوئی کہ میں پڑوسی کو حقوق العباد یاد دلانے گیا تھا لیکن میں خود اپنے پڑوس سے غافل تھا۔ ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ اس حال میں حج پر جاؤں کہ میرا پڑوسی بھوکا رہے۔

گھر والے سو گئے تو میں چپکے سے اٹھا اور اشرفیوں کی تھیلی پڑوسی کو دے آیا۔

کچھ توقف کے بعد احمد بن اسکاف نے کہا، میرے گھر والے بے خبر ہیں کہ میں نے سفر پر جانے سے چند گھنٹے پہلے حج کا ارادہ کیوں ملتوی کیا اور اشرفیوں کی تھیلی کہاں گئی۔

حج کے لئے رقم جمع کی تھی۔ برسوں سے اس وقت کا انتظار تھا لیکن جو کچھ میں نے دیکھا— اس کے بعد حج نہ کرنے کا غم ضرور ہے لیکن زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میرے پڑوسی اور اس کے بچے ہلاکت سے بچ گئے۔ یہ اللہ کا مجھ پر کرم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احمد بن اسکاف کے روزگار میں برکت دی اور اگلے سال حج کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

حرم پاک کی فضا

خوشا وہ دن حرم پاک کی فضاؤں میں تھا
زباں خموش تھی دل محو التجاؤں میں تھا
غلاف خانۂ کعبہ تھا میرے ہاتھوں میں
خدا سے عرض و گزارش کی انتہاؤں میں تھا
در کرم پہ صدا دے رہا تھا اشکوں سے
جو ملتزم پہ کھڑے تھے میں ان گداؤں میں تھا
حطیم میں میرے سجدوں کی کیفیت تھی عجب
جبیں زمیں پہ تھی ذہن کہکشاؤں میں تھا
بھڑک رہا ہے میرے ساز روح پر اب بھی
وہ ایک نغمہ جو لبیک کی صداؤں میں تھا
مجھے یقین ہے میں پھر بلایا جاؤں گا
کہ یہ سوال بھی شامل میری دعاؤں میں تھا
فضائے معرفت آثار میں تھا دل سرشار
میرا وجود خدا کے کرم کی چھاؤں میں تھا
خوشا وہ دن حرم پاک کی فضاؤں میں تھا
زباں خموش تھی دل محو التجاؤں میں تھا

(کلام: سید صبیح الدین صبیح)

الیکٹران کیا ہے ــــ؟

حامد ابراہیم مصور اور خطاط ہیں۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے لئے باقاعدگی سے مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں منفرد اور گہری سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔ الیکٹران کی دنیا سے متعلق اس مضمون میں بھی غور و فکر کرنے والوں کے لئے رموز ہیں۔ قارئین مضمون پڑھ کر سوال کر سکتے ہیں۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے،

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے باہم تبدیل ہونے میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (اٰل عمرٰن:۱۹۰)

کائنات میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شے میں نشانیاں ہیں جو غیر جانب داری سے تفکر کرنے والے فرد پر یقین اور علم و معرفت کے در وا کرتی ہیں۔ آسمانی دنیا ہو، روشنی کا زون ہو یا ہماری زمین ــــ ہر تخلیق خالق و مالک، احد و صمد اللہ تعالیٰ کا پتہ دیتی ہے کیوں کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

کرۂ زمین میں آدمی کی شماریات سے زیادہ مخلوقات جنگل، پہاڑ، ریگستان، سطحِ مرتفع اور وسیع و عریض میدان سب کی بنیاد ذرّات ہیں۔ ذرّات مزید چھوٹے ذرّات سے مل کر بنے ہیں۔ یہ چھوٹے ذرّات روشنی کے تانے بانے سے مرکب ہیں۔

ذرّات آپس میں پیوست اور یک جان ہو کر کہیں چٹانوں اور پہاڑوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کہیں بکھر کر ریگستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کہیں آدمی، چوپائے یا درخت بنتے ہیں اور کہیں ایجادات اور صنعت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

مادہ کی ظاہر خصوصیات میں ٹھوس پن، مائع، گیسی حالت، جمود، وزن، حجم، کثافت اور تغیر شامل ہے۔ یہ سب مزاحمت اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتے ہیں۔ جب کہ مادہ کے انتہائی چھوٹے ذرّات یعنی ایٹم اور ایٹم کے ذیلی ذرّات کی دنیا (quantum realm) میں ایسے عوامل کارفرما ہیں جو مادہ کی عام خصوصیات سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہ عوامل اور مظاہر نشانیاں ہیں جو نوعِ آدم کو مادہ کے خول سے نکل کر روشنی اور نور کی دنیا میں داخل ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔

ایٹم کے ذیلی ذرّات میں ممتاز ذرّہ الیکٹران ہے۔

اگر چہ ایٹم کا وجود تمام ذیلی ذرّات کے مشترکہ خواص پر قائم ہے لیکن ایٹم کا بیرون، الیکٹران پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر قسم کا ایٹم الیکٹران کے غلاف میں بند ہے۔ نیوکلیائی تعاملات (reactions) اور تقریباً تمام کیمیائی اور طبعی مادی خواص الیکٹران کی مرہون منت ہیں۔ گویا ماحول اور ہمارے جسم کا مادہ مختلف عناصر یعنی متفرق اقسام کے ایٹموں پر مشتمل ہے مگر ہم زندگی الیکٹران کے زیر اثر گزارتے ہیں جو ایٹم کا بیرونی حصہ ہے۔

حواس خمسہ کا دارومدار الیکٹران پر ہے۔ الیکٹران کی خصوصیات اور طرز عمل حیرت انگیز اور دل چسپ ہیں۔ اگر کسی طریقہ سے الیکٹران کی خصوصیات کسی بڑے حجم میں متحرک کردی جائیں تو بڑے حجم کی شے کائنات میں پلک جھپکتے کہیں بھی منتقل کی جاسکتی ہے۔

الیکٹران کی خصوصیات کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

الیکٹران کہاں ہے ــــ؟

ہائیڈروجن کا ایٹم سادہ ترین ہے۔ مرکز میں ایک پروٹان اور اس کے گرد ایک الیکٹران محو گردش ہے لیکن گردش دائرہ یا بیضوی مدار میں ہرگز نہیں بلکہ پروٹان کے گرد ایک کرہ* کی صورت میں ہو رہی ہے۔ گردش کے کروی مدار کی کوئی واضح حدود نہیں، یہ مرکزہ (نیوکلس) کے گرد دھند کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ یعنی اگر ہم ہائیڈروجن کے الیکٹران کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو وہ مرکزہ کے گرد دھندلے کرہ میں کسی لمحہ کہیں بھی ہوسکتا ہے۔

اگر ہم مرئی روشنی میں الیکٹران کو دیکھنا چاہیں تو نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ الیکٹران کا حجم مرئی روشنی کے طول موج سے بھی چھوٹا ہے۔ اگر چھوٹے طول موج اور زیادہ فریکوئنسی کی روشنی استعمال کی جائے تو اس روشنی کی توانائی سے الیکٹران کا مقام تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم الیکٹران کے مقام اور حرکت کا حتمی تعین نہیں کرسکتے۔ محققین نے اس عجز کو ایک قانون سے ظاہر کیا ہے کہ الیکٹران کا مقام (پوزیشن) اور حرکت کی رفتار (مومینٹم) بیک وقت معلوم نہیں کی جاسکتی۔

سوال: اگر الیکٹران کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا تو مادی حواس ہمہ وقت جو دیکھتے، سنتے یا چکھتے ہیں وہ سب کیا ہیں؟ کیا ہم الیکٹران سے براہ راست مخاطب ہوسکتے ہیں ــــ؟

الیکٹران کیا ہے ــــ؟

اگر الیکٹران مادی ذرّہ ہے پھر خاص مقام پر اس کی نشان دہی کیوں نہیں کی جاسکتی؟ وجہ یہ ہے کہ الیکٹران ہمہ وقت حرکت پذیر ہے اور یہ حرکت بالکل سیدھی یا دائرہ میں نہیں بلکہ سائن ویو (∿∿∿) کی صورت میں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

---

* کرہ (گیندنما-sphere)

محققین کہتے ہیں کہ الیکٹران کا طرزِ عمل دہرا ہے۔ بعض حالات میں یہ ذرّہ جب کہ بعض میں لہر کی خصوصیات ظاہر کرتا ہے۔الیکٹران میں موجود مقدار سے واضح ہے کہ الیکٹران مادی ذرّہ ہے جو لہر کی شکل میں حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح فوٹان وہ ذرّہ یا شے ہے جس میں بظاہر مادی مقدار اور ابعاد نہیں البتہ توانائی موجود ہے۔لیکن محض توانائی پر مشتمل ہونے کے باوجود ذرّہ اور لہر دونوں کی خصوصیات فوٹان میں موجود ہیں۔قرآن کریم میں ہر شے کی دہری نوعیت کی سائنس کو بیان کیا گیا ہے۔خالق کائنات فرماتے ہیں،

''اس نے ہر طرح کے ثمرات کے جوڑے دہرے پیدا کئے ہیں۔'' (الرعد:۳)

الیکٹران اور کوانٹم سرنگ:

کیا مادی وجود کا کائنات میں ایک جگہ سے اچانک غائب ہو کر بظاہر بغیر کسی وقفہ کے، دور دراز یا نزدیک جگہ پر صحیح سلامت ظاہر ہونا ممکن ہے—؟

مثال کے طور پر طالب علم ٹینس کی گیند دیوار پر مسلسل مارتا ہے۔گیند دیوار سے ٹکراتے ہوئے پلٹتی ہے اور دوبارہ طالب علم کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔گیند دیوار سے خواہ کتنی مرتبہ کیوں نہ ٹکرائے، ایسا نہیں ہوتا کہ دیوار کے دوسری طرف نکل جائے اور دیوار اپنی حالت میں برقرار رہے۔ ہزاروں لاکھوں بار گیند کے ٹکرانے سے ایک مرتبہ بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ گیند دیوار کی رکاوٹ بیک جنبشِ ابرو پار کر کے دوسری طرف نکل جائے — لیکن الیکٹران کی سطح پر ایسا ممکن ہے۔

متحرک الیکٹران کے سامنے رکاوٹ ہو تو زیادہ امکان ہے کہ الیکٹران رکاوٹ سے ٹکرا کر پلٹ آئے اور یہ عمل جاری رہے لیکن یہ امکان بہرحال موجود رہے گا کہ الیکٹران رکاوٹ توڑ کر دوسری طرف منتقل (teleport) ہوسکتا ہے اور ایک مقام سے غائب ہو کر کائنات میں کہیں بھی دوسرے مقام پر ظاہر ہوسکتا ہے۔الیکٹران کا رکاوٹ کو غیر معمولی طریقہ سے عبور کرنا tunneling effect کہلاتا ہے۔

۱۔الیکٹران اور دوسرے ایٹمی ذرّات کا ایک نقطہ سے غائب ہو کر دوسرے نقطہ پر ظہور کیا غیر مادی صلاحیت اور عمل کا اظہار نہیں ہے؟

۲۔کیا ہم الیکٹران اور دوسرے ایٹمی ذرّات کی غیر معمولی صلاحیتوں کو تصرف میں لا کر بڑے مادی اجسام کو کہیں بھی منتقل کر سکتے ہیں؟

۳۔اس غیر معمولی صلاحیت کا حصول کیسے ممکن ہے؟

محققین نے کسی حد تک دریافت کیا ہے کہ ان ذرّات میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے لیکن اس صلاحیت پر تصرف کیسے ہو، یہ بات ابھی سائنس کی حدود سے باہر ہے!

کائنات کی ہر خشک و تر شے کا علم قرآن کریم میں موجود ہے۔حضرت سلیمانؑ اور ملکہ بلقیس کے تخت

کو حاضر کرنے کا واقعہ قرآن کریم میں ہے۔

وہ کون سا علم ہے جس کے تحت بھاری بھر کم تخت پلک جھپکنے سے بھی کم وقفہ میں سینکڑوں میل دور صحیح و سالم منتقل کیا گیا؟

ایٹم، الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ کی دریافت کو ڈیڑھ سو سال بھی مکمل نہیں ہوئے جب کہ آفاقی اسرار و قوانین کے علوم ہر دور میں الہامی کتب میں بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کائناتی فارمولوں کے علوم کی عظیم ترین اور حتمی الہامی دستاویز ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے قصص میں ان علوم اور ٹیکنالوجی کا بیان ہے جو مادہ کی سطح تک محدود نہیں بلکہ مادہ کی بساط اور روح کی صلاحیت کا علم دیتی ہیں۔

مادی محققین کی کوشش قابل قدر ہے۔ انہوں نے متعدد ایجادات کی ہیں لیکن الہامی کتب میں مادی ذرّات اور الیکٹران وغیرہ کی غیر مادی خصوصیات نوع آدم کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ مادہ کی کنہ میں موجود غیر مادی حقائق کو تلاش کرے۔ اب یہ دور حاضر کے محقق پر منحصر ہے کہ وہ ذرّات کے غیر مادی رخ کو تحقیق کا مرکز بناتا ہے یا فکر و نظر کو مادہ تک محدود رکھتا ہے۔

کائنات میں ایک الیکٹران کا تصور:

1940ء کے موسم بہار میں ماہر طبعیات جان اے ویلر کو خیال آیا کہ کیا وجہ ہے کہ کائنات میں موجود تمام الیکٹران ایک ہی چارج اور مادہ کی یکساں مقدار رکھتے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ سب ایک الیکٹران ہوں۔ اس نے خیال کا اظہار اپنے قابل شاگرد سے کیا۔ شاگرد بھی سوچ میں پڑ گیا۔ بظاہر یہ عجیب اور دور پرے کی بات لگتی ہے لیکن کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟

ویلر نے اس خیال کو رد نہیں کیا بلکہ سوچ بچار جاری رکھا کہ ممکن ہے ایک ہی الیکٹران ٹائم اسپیس میں لمحہ بہ لمحہ خود کو دہرا رہا ہو جس سے لگتا ہو کہ بہت سارے الیکٹران ہیں۔ ایک ہی الیکٹران ماضی حال اور مستقبل کی پٹی پر آگے اور پیچھے کی طرف رواں دواں ہو۔ چوں کہ فرد لمحۂ موجود میں زندگی گزارتا ہے، اسے الیکٹران کی ہمہ جہت حرکت سے گمان ہوتا ہو کہ لاشمار الیکٹران بے شمار جگہوں پر موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی الیکٹران جب ٹائم اسپیس میں آگے کے بجائے پیچھے کی طرف حرکت کرتا ہو تو پازیٹران کہلاتا ہو۔ یہ موضوع اگرچہ مختلف اور تعجب خیز ہے لیکن محقق سوچ بچار کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر الیکٹران ایک ہے تو تخلیقات کی انفرادیت کس طرح قائم ہے—؟

ممثل کلیات ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کثرت میں ہر ایک فرد کی ذات کے ساتھ خود کو وابستہ کر رہے ہیں۔ ہر فرد کی منفرد حیثیت اس ہی لئے اپنی جگہ قائم ہے۔ روشنی کا مرکز ایک ہی چراغ ہے۔ زید اور محمود دونوں کو ایک ہی چراغ سے روشنی مل رہی ہے۔ البتہ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ

تغیر روشنی میں واقع نہیں ہوتا۔ روشنی بدستور اپنی حالت پر قائم ہے۔صرف زید اور محمود کے طرز بیان میں تغیر ہے کیوں کہ وہی روشنی زید میں زید کی تصویر حیات ہے اور محمود میں محمود کی۔تصوف میں اس طرز کو مرتبہ کہتے ہیں۔ اگر ہم مرتبہ کا ترجمہ عام زبان میں کرنا چاہیں تو انگریزی کا ایک لفظ 'میکانزم' استعمال کر سکتے ہیں۔ میکانزم کی اساس ایک ہے۔ فقط نام الگ الگ ہیں۔ یہی میکانزم یا مرتبہ لاشمار انواع پر مشتمل ہے۔ یہی میکانزم آدمیوں میں زید اور محمود ہے اور یہی درختوں میں آم اور بادام ہے۔ ایک ہی روشنی ہے جو ان سب کی شکلیں بناتی ہے۔ یہ میکانزم (مرتبہ) ایسے سیاہ نقطوں سے بنا ہے جو کائنات کی اصل ہے۔ ان سیاہ نقطوں کو تجلی کہتے ہیں۔ ان کی گردش دہری ہوتی ہے۔قرآن پاک میں جہاں اللہ تعالیٰ نے تکرار کا مفہوم استعمال کیا ہے وہاں یہی دہری حرکت مراد ہے۔ دہری حرکت ہر سمت میں واقع ہوتی ہے۔اس طرح بیک وقت وہ ہر پہنائی، ہر گہرائی، ہر سمت اور وقت کے کم ترین یونٹ میں جاری و ساری ہے۔ یہ دہری حرکت صدوری ہوتی ہے یعنی سیاہ نقطہ جو زمان (time) ہے پہنائی، گہرائی اور سمتوں میں پے در پے چھلانگ لگاتا رہتا ہے۔ جہاں تک اس نقطہ کی چھلانگ ہے وہاں تک مکان (space) کی شکل وصورت بنتی رہتی ہے۔ اس سیاہ نقطہ میں وہ ساری شکلیں جو مکانی شکل و صورت میں نظر آتی ہیں مخفی ہیں۔ جب یہ نقطہ چھلانگ لگاتا ہے تو مخفی مظاہر کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس ہی روپ کا نام کائنات ہے۔ اس نقطہ میں لاشمار پردے ہیں۔'' (لوح وقلم)

قارئین کرام ! ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ کی بصیرت افروز تحریر غور سے پڑھئے۔

روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کائناتی حقائق خواہ وہ مادہ سے متعلق ہوں یا رنگ ونور کی دنیا سے، ان سے آگہی صرف ان قدسی نفس خواتین وحضرات کو حاصل ہے جن کی فراست قیاس اور فلسفہ نہیں بلکہ اللہ کا نور ہے۔حدیث مبارک ہے،

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔'' (ترمذی)

اولیاء اللہ کی تعلیمات انبیائے کرام کے علوم کے تابع ہیں۔ ذرّہ یا کرہ کی حقیقت کا علم انبیائے کرام کے علوم کو سمجھنے اور ان میں تفکر کئے بغیر ممکن نہیں۔ الیکٹران درحقیقت کن مقداروں پر مشتمل ہے اور ان پر تصرف کس طرح ممکن ہے ـــ قرآن کریم میں کائنات کی تسخیر سے متعلق فارمولے موجود ہیں۔

''اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ 'ہو' اور وہ ہو جاتی ہے۔'' (یٰسٓ: ۸۲)

کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم کُن کا مظاہرہ ہے۔اللہ کا حکم ہر فرد کی زندگی ہے اور زندگی خود کو دہرا رہی ہے۔ اگر فرد اپنے اندر دور کرنے والی الیکٹری سٹی سے واقف ہو جائے تو اسے زمان ومکان کا وقوف ہو جائے گا۔

چلو ــــ ناگپور چلیں

میں تو فقیر کی ملاقات کے لئے ناگپور آیا ہوں نہ کہ راجا صاحب کی ملاقات کے لئے۔ اگر اتفاق سے فقیر راجا کے مکان میں ہے تو بھی وہ مکان اس درویش یا مہاتما کے رہنے تک دربارِ عام سمجھا جائے گا۔

بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے عقیدت مندوں میں حیدرآباد دکن کے مہاراجا سرکشن پرشاد بھی ہیں۔ ان کو اولیائے کرام سے عقیدت تھی۔ مہاراجا پرشاد کے مطبوعہ سفرناموں میں ایک ''سیر ناگپور'' ہے۔

سفر کی غرض وغایت اور مختصر احوال پڑھئے۔

مہاراجا سرکشن پرشاد کہتے ہیں کہ،

تین مہینے ہوئے میرے عزیز باتمیز سید معین الدین خان نے جو سردار عبدالحق دبیر الملک مرحوم کے نواسہ تھے، مجھ سے برسبیل تذکرہ کہا تھا کہ ناگپور میں وا کی اسٹیشن کے قریب ایک بزرگ تاج الدین ولیؒ کے نام سے مشہور ہیں ــــ کامل اور مستجاب الدعوات ہیں۔

ان کی رطب اللسانی کا تخم میرے دل میں بویا گیا اور شوق نے ذوقِ دید کی آبیاری کی۔ کم سنی سے مجھے بزرگوں سے بلا تفریق ملت و مذہب خاص عقیدت ہے۔ میری گھٹی میں عقیدت کا پٹ پڑا ہے۔ ارادہ کو تحریک ملی کہ چل کر زیارت کرلوں۔ لیکن جیسے کہ ہر کام کا وقت مقرر ہے، کے سبب میرے پرِ پرواز شکستہ تھے۔ ارادہ رفت وگذشت ہوگیا۔

دنیا عالم اسباب ہے، کسی سبب کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ میرا تیسرا لڑکا عثمان پرشاد دانتوں کے انفیکشن کے باعث علیل ہوگیا۔ بیماری نے طوالت اختیار کی اور بخار 101 سے 102 کے درمیان اترتا چڑھتا رہا۔ ڈاکٹر اور یونانی اطبا نے بخار کا سبب دانتوں میں انفیکشن بتلایا اور دیگر نے صفرا اور بلغم کے اجتماع کو سبب ٹھہرایا۔ رائے دی گئی کہ مقام تبدیل کیا جائے۔

مشکل یہ تھی کہ میری تیسری دختر کی شادی مہاراجا کشمیر کے معتمد لالہ مہر چند کے فرزند سے قرار پائی تھی اور مہینہ جمادی الآخر (مطابق مئی) مقرر کیا گیا تھا۔ تشویش ہوئی کہ اس کو کس طرح پورا کروں۔

بالآخر طے ہوا کہ فی الحال وقار آباد چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا اچھی سمجھی جاتی ہے، ریل کے ذریعے حیدرآباد سے دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ چناں چہ میں فوراً نظامِ دکن سے دو ہفتے کی رخصت لے کر بیٹے اور اہلیہ کو لے کر وقار آباد آ گیا۔

وقار آباد میں دو روز تک طبیعت ٹھیک رہی اور بخار میں کمی ہوئی پھر ایک شب سرد ہوا چلی اور بارش ہوئی، عثمان کو نزلہ اور کھانسی شروع ہوئی اور بخار بھی بڑھ گیا۔ چار و ناچار حیدرآباد واپس ہو کر اپنے باغ عثمان منزل میں قیام کیا لیکن عثمان پر شاد صحت یاب نہ ہوئے۔

لاہور سے بیٹی کی برات آئی اور عثمان منزل سے گھر آنا پڑا۔ یہاں آنے کے بعد مرض میں مزید شدت آئی۔ پریشانی کے عالم میں سات تاریخ کو رسم ادا کر کے اضطراب اور بے چینی میں یہ مناجات کہی۔

مبتلائے رنج ہستم یا خدا فریاد رس
عبدِ ناشاد تو ام رحمے نما فریاد رس
آب غم از سرگزشت و تاب صبر اصلا نماند
از برائے مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ فریاد رس
نور چشمم را بحفظ خود بدار از چشم زخم
ہست در تپ مبتلا اے کبریا فریاد رس
نعمت صحت عطا فرماش با عمرِ طویل
ایہا الشافی بدہ او را شفا فریاد رس

ترجمہ: اے اللہ میں غم میں گرفتار ہوں، میری فریاد سن لیجئے۔ پریشان بندہ ہوں، رحم کیجئے اور فریاد سن لیجئے۔ غم کا طوفان حد سے گزر گیا ہے اور صبر کی تاب نہیں رہی۔ بواسطہ حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حضرت علی مرتضیٰؑ فریاد قبول کیجئے۔ میری آنکھوں کے نور میرے فرزند کو اپنی حفاظت میں نظر بد سے محفوظ رکھئے۔ وہ بخار میں مبتلا ہے۔ اے باری تعالیٰ! فریاد سن لیجئے۔ اسے صحت کے ساتھ طویل عمر عطا فرمایئے۔ اے شفا دینے والے! اسے شفا عطا فرمایئے۔

دوسرے دن عثمان کی حالت بگڑ گئی۔ طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے پیارے کی حالت یہاں رہ کر دیکھوں۔ فوراً ریل کے سیلون* کا انتظام کر کے چند روز کے لئے شادی ملتوی کر دی۔ آٹھ تاریخ بروز جمعرات مغرب کے وقت سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے بحالت اضطراب روانہ ہوا اور برخوردار کی والدہ سے کہہ دیا کہ اللہ سے دعا کرتی رہیں، انشاء اللہ بخار میں کمی ہوگی، اس وقت واپسی ہوگی۔

منصب دار مرزا احمد بیگ، رام چندر پرشاد اور چند ملازمین کو لے کر ریل میں سوار ہوا۔ چلتے وقت بعض احباب نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ناگپور جا کر حضرت تاج الدین باباؒ کے درشن کر لیں۔ بات دل کو لگی۔ ناگپور کی سمت روانہ ہوئے اور تمام سفر بیداری اور اختر شماری میں گزارا۔

اس سے قبل اہلیہ اور بچہ کے ہم راہ جب وقار آباد سے واپس ہوئے تھے تو منصب دار مرزا احمد بیگ کو اس وقت کی معروف مجذوبہ زہرہ بی بی صاحبہ کے پاس بھیجا اور تاکید کی تھی کہ صرف سلام پہنچا کر نذر پیش کریں۔ چناں چہ مرزا احمد بیگ نے سلام پہنچایا۔ زہرہ بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ،

''وہاں جا کر آؤ، سب کچھ ہوگا۔''

فقرہ کی تاویل وتعبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی اور بات رفت وگذشت ہوگئی۔ ریل میں مرزا احمد بیگ نے برسبیل تذکرہ اس جملہ کی طرف توجہ دلائی تو عقدہ کھلا کہ زہرہ بی بی صاحبہ نے دراصل حضرت تاج الدین باباؒ کی خدمت میں حاضری کا اشارہ کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور اس کی وحدت کا ثبوت ہم کو ہر وقت اور ہر آن ملتا ہے مگر غفلت کا پردہ عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ ہم محسوس نہیں کرتے۔ دنیوی تعلقات اور اس کی نیرنگیوں کے تماشوں کو ماسوا اللہ کی شان میں دیکھ دیکھ کر اپنی اوقات کو خراب کرتے ہیں۔ ورنہ اگر بغور تمام اور بنظر تعمق* دیکھا جائے تو ہر شے اس کے وجود کے سبب سے ہے۔ ادھر زہرہ بی بی نے جانے کی خبر دی اور اس کے اسباب بظاہر ایسے جمع ہوئے کہ تاج الدین باباؒ کی ملاقات کا عزم ہوگیا۔ بابا نانک صاحب توحید کے بارے میں کیا خوب فرماتے ہیں،

آپے کیا کرایا آپے کرنے جوگ
نانک ایکو رم رہیا دوجا ہوا نہ ہوگ

ترجمہ: سب کچھ اللہ کرتا ہے اور وہی کرسکتا ہے۔ نانک ایک کے ہی قائل رہو۔ دوسرا نہ ہوا ہے نہ ہوگا!

اور یہی ایمان کا چراغ ہے جس کو روشن ضمیر ہستیاں قبر میں بھی چراغ تہ داماں کی طرح محفوظ لے جاتی ہیں اور نجات ابدی اور سرور دائمی حاصل کرتی ہیں۔ خدا تعالیٰ — شاؔد (مجھے) کو بھی بامراد کرے، آمین۔ اور رب العزت کے ان مقرب بارگاہ بندوں کے طفیل مجھے دربار حقیقی کے درباریوں کا کفش بردار* بنادے کہ اسی بہانہ دربار گہربار وحدت تک رسائی ہوجائے۔

شب کچھ باتوں اور کچھ نیند میں گزری۔ ادھر شمع کو کوچ کا پروانہ ملا، ادھر خورشید خاور نے تمام عالم پر نور کا کافور بکھیر دیا اور دنیا اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوئی۔ میں نے اپنے افکار وتوہمات اور تخیلات کو سفر میں زادِراہ بنایا تھا۔ بستر سے اٹھتے ہی دریافت کیا کہ گھر سے کوئی تار آیا کہ نہیں۔ جواب نفی میں ملا۔

طبیعت اور زیادہ بے چین ہوئی۔

الغرض 12 بجے کے قریب منماڑ اسٹیشن پہنچا۔ ساتھیوں سے کہہ دیا کہ سیلون بُھساول جانے والی ریل گاڑی کے ساتھ لگا دیا جائے۔ پون گھنٹہ بعد گاڑی بُھساول کی طرف روانہ ہوئی۔ دوسرے دن 10 تاریخ کو شام پانچ بجے ناگپور پہنچے۔

ناگپور پہنچنے سے پہلے رام چندر پرشاد نے حقائقِ معرفت کے متعلق بابا نانک صاحب اور کبیر داس جی کے اشلوک پڑھے اور سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ توحید کے معنی تو ایک ہیں مگر بعض نے مخفی رکھا ہے اور بعض نے بصراحت بیان کیا ہے اور اکثر اشاروں کنایوں کے پابند رہے؟

مجھے حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ کا ایک مقولہ یاد آیا۔ مقولہ کو نقل کرنے کے بعد میں نے کہا،

''ہر کس و ناکس معرفتِ توحید کے مسائل پر گفتگو نہیں

کرسکتا اور نہ ہر شخص اس کے سننے کے قابل ہوسکتا ہے۔ اس لئے معروف قول 'لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو' پر عمل کرنا مناسب ہے۔''

ناگپور پہنچنے پر معلوم ہوا کہ حضرت تاج الدین باباؒ، راجا رگھوراؤ بھوسلے کے مکان میں دو مہینے سے مقیم ہیں اور راجا صاحب نے نہایت عقیدت سے ان کو اپنے گھر کی دولت بنا رکھا ہے۔

مغرب کا وقت قریب تھا اور راجا رگھوراؤ کے مکان پر بے تعارف جانا مناسب نہیں تھا۔ مرزا احمد بیگ کو روانہ کیا کہ ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دینا اور حالات سے واقفیت حاصل کر کے آنا۔

چناں چہ مرزا احمد بیگ گئے۔ بابا تاج الدینؒ اس وقت لیٹے ہوئے تھے۔ موقع دیکھ کر مرزا صاحب نے سلام پہنچایا۔ تاج الدین باباؒ نے جواب دیا،

''چراغ رکھ کر چراغ کی فکر کرتا ہے۔ کہہ دے گھر چلا جائے۔''

پیغام اپنے حق میں بہتر معلوم ہوا۔ پھر کچھ فکر ہوئی کہ بابا صاحبؒ مجذوب اور طبیعت کے تیز ہیں، نہیں معلوم اس جملہ کا کیا مطلب ہے۔

میں نے نظام کو مضمون کا تار دیا کہ حضرت تاج الدین باباؒ کی زیارت کو ناگپور آیا ہوں۔ وہ چند ماہ سے راجا راگھوراؤ بھوسلے کے مہمان ہیں چوں کہ ان سے ملاقات ضروری ہے اور آپ کی ایما کے بغیر راجا کے مکان پر نہیں جا سکتا اس لئے اطلاعاً عرض ہے کہ ایک بار مجھے راجا کے مکان پر جانا پڑے گا۔

میرے ساتھ آئے رام چندر پرشاد نے اطلاع دی کہ ناگپور کے باشندے ڈاکٹر گورے کی خواہش ہے کہ جب تک آپ کا قیام ناگپور میں ہے، اس کی میزبانی قبول کریں۔ میں حیدرآباد سے اچانک نکلا تھا اس لئے نظامِ دکن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ ان کی اجازت کے بغیر بیرون شہر کسی کی میزبانی قبول نہیں کرسکتا تھا۔ چناں چہ اسٹیشن پر اپنے سیلون میں رات گزاری۔

صبح گھر سے تار آیا کہ شب کو عثمان کی حالت زیادہ خراب تھی۔ کچھ دیر بعد عبدالعزیز نامی ایک شخص ملنے آیا اور بتایا کہ راجا رگھوراؤ بھوسلے کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بابا صاحبؒ سے ملاقات کے لئے ان کے توسط سے کام لیا جائے۔

مجھے خیال ہوا کہ یہ بات راجا رگھوراؤ نے نہیں کی ہوگی۔

میں نے کہا، میں تو فقیر کی ملاقات کے لئے ناگپور آیا ہوں نہ کہ راجا صاحب کی ملاقات کے لئے۔ اگر اتفاق سے فقیر راجا کے مکان میں ہے تو بھی وہ مکان اس درویش کے رہنے تک دربارِ عام سمجھا جائے گا۔ درویش سے خاص مکین کے ذریعے ملنا ہماری دکن کی ریاست کا دستور نہیں۔ اکثر میرے گھر میں ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بعض درویش اور مہاتماؤں نے دنوں تک

آسن جمایا۔ صدہا چھوٹے بڑے جاگیر دار اور امرا آتے تھے مگر کبھی میں نے اس امر کی خواہش نہیں کی کہ درویش میرے مہمان ہیں اس لئے طالبِ دیدار پہلے مرے پاس آئیں۔ میں باباصاحبؒ سے ملاقات کے لئے آیا ہوں اور پسند نہیں کرتا کہ سواری اور گاڑی کے لئے راجا رگھوراؤ کو تکلیف دوں۔ میں عام زائرین کے ساتھ باباصاحبؒ کی دید سے مستفیض ہوں گا۔

بعد میں پیغام ملا کہ چھ سات بجے کے قریب باباتاج الدینؒ سے ملنے کا وقت مناسب ہے۔

رام چندر پرشاد سے کہا کہ آج کسی طرح تاج الدین باباؒ کے درشن کرنا چاہتا ہوں لہٰذا کوئی موٹر تلاش کرو خواہ کرایہ کی کیوں نہ ہو۔ تھوڑی کوشش کے بعد موٹر مل گئی۔ لباس تبدیل کر کے چار بجے دو مصاحبوں کو لے کر نکلا۔ جہاں تک گیا اور دیکھا نا گپور کی بستی کو خوش نما پایا۔ سڑکیں سینۂ بے کینہ کی طرح صاف۔ اس کے دو رویہ گھنے درخت مسافر اور راہ گزر پر سایہ ڈالتے ہیں۔ مکانات کی عمدہ ترتیب اور راستے وسیع۔ چلتے چلتے راجا کے باغ تک پہنچے جہاں باباتاج الدینؒ مقیم تھے۔

موٹر سے اتر کر اندر داخل ہوا — دیکھتا ہوں کہ زائرین کا تانتا بندھا ہوا ہے اور وہ بابا کے توسط سے فضلِ باری کے منتظر ہیں۔ اس وقت تاج الدین باباؒ دوسری طرف متوجہ تھے۔ میں ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میری طرف نظر کی — بقول شخصے،

نین چھپائے نہ چھپے پٹ گھونگھٹ کے اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ

ترجمہ: نظروں کا وار گھونگھٹ کی اوٹ سے بھی اثر کرتا ہے۔ خوب صورت عورت اور بہادر سورما لاکھوں کے مجمع میں بھی اپنا کام دکھا دیتے ہیں۔

نظر کا ملنا تھا کہ قلب پر ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔ درحقیقت نسبت نہایت قوی اور نظر میں برقی قوت تھی۔ میں نے ان کی دید سے آنکھ نہیں چرائی، دس منٹ یا اس سے زائد عرصہ گزرا ہوگا۔

باباصاحبؒ نے فرمایا،

''شرارتیں نہیں کرتے۔ جاؤ سیدھے گھر جاؤ۔''

میں سلام کر کے واپس ہوا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ میں ان سے کچھ کہوں گا مگر ان کی زبردست نسبت نے مجھے ہر طرح مطمئن کر دیا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ،

آئینہ کی مثال میرا سارا حال ہے
پنہاں ہے بات کون سی روشن ضمیر سے

تھوڑی دور تک چلا تو وہ میرے پیچھے آئے۔ ایک مائی صاحبہ بیٹھی تھیں، ان سے چوڑی لی اور مجھے دیتے ہوئے کہا کہ، ''لو، بس اب جاؤ۔''

چوڑی لی اور سلام کر کے واپس ہوا۔ وہ میرے ساتھ آئے۔ ایک طرف کبوتر اڑ رہے تھے۔ کبوتروں کی جانب مخاطب ہو کر گملوں میں سے تھوڑی مٹی اٹھائی اور کبوتروں کی طرف ڈال کر اللہ جانے کیا فرماتے رہے۔

میں تو ان کی دید میں محو تھا۔

اللہ اللہ اس کی یک رنگی کے کیا کیا تماشے ہیں۔ انسان جو بھی اپنی طرف ہر ایک چیز کو منسوب کر کے ''میں اور تو'' کے پھیر میں پڑا ہوا ہے، اللہ گواہ ہے کہ اس کا عمل غلط، بالکل غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے،

آن کس کہ خاکِ ما را گلے کرد و خانہ ساخت
خود درمیاں درآمد و ما را بہانہ ساخت

ترجمہ: وہ جس نے خاک سے ہمارا بدن بنایا اور اسے روح کا گھر کر دیا۔ دراصل وہی اس جہان میں سب کچھ کرتا ہے اور ہمیں بہانہ بنا رکھا ہے۔

اس اثنا میں ایک معتقد سگریٹ روشن کر کے بابا صاحبؒ کی طرف متوجہ ہوا۔ بابا تاج الدینؒ نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا کہ یہ تو ان کو دو، یہ پئیں گے، ان کے واسطے۔

جب میں جانے لگا تو جیسے فوجی سلام کرتے ہیں، اس طرح سلام کر کے یہ الفاظ کہے،

''All right and good morning''

اس سے بہتر اور نیک فال کیا ہو سکتی تھی۔ وہ میرے ساتھ وہاں تک آئے جہاں میں موٹر سے اترا تھا۔ وہاں سے وہ دوسری طرف چلے گئے اور میں خدا حافظ کہہ کر واکی کے قریب اپنے مسکن پر روانہ ہوا۔

ادھر زلفِ یار نے کمر تک رسائی کی، ادھر نصف شب نے سیاہ چادر کمر تک تان لی۔

دوسرے روز منماڑ پہنچا۔ بذریعہ تار اطلاع ہوئی کہ برخوردار عثمان پرشاد روبہ صحت ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اب خطرہ کی بات نہیں۔ بخار 101 سے زیادہ نہیں ہے۔ الحمدللہ مسرت آمیز نوید کے سننے سے دلِ شاد باغ باغ ہوا۔

گھر پہنچ کر سب کو خیر و عافیت کے ساتھ پایا۔

سجدۂ شکر بجا لایا اور بیٹی کی شادی کی تقریبات کے آغاز کا حکم دیا۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ ہر بات کا انجام بخیر کرے، آمین۔

نانا تاج الدین ناگپوریؒ فرماتے ہیں،

مانس ہے سب آتما، مانس ہے سب راکھ
بندی کی گنتی نہیں، بندی میں سو لاکھ

تشریح: بابا تاج الدینؒ آدمی کو محض مٹی سے مرکب تسلیم نہیں کرتے۔ آدمی بظاہر مٹی معلوم ہوتا ہے لیکن مٹی کے ساتھ ساتھ وہ روشنیوں کا مجموعہ ہے۔ ایسا مجموعہ جو کائنات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مایوس کن بات یہ ہے کہ اس نے خود کو مٹی کا پابند بنا رکھا ہے۔ اگر انسان اپنی ذات سے واقف ہو جائے تو مظاہر (اسپیس) کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی عرفانِ نفس ہے۔

---

* سیلون (بااثر افراد کے لئے ریل میں خصوصی بوگی جو سہولیات سے آراستہ ہوتی ہے۔)
* نظرِ تعمق (عمیق یا گہری نظر سے) * کفش بردار (جوتیاں اٹھانے والا)

عابد محمود

غیب ــــ حاضر ــــ کہانی

دیگر فنکاروں نے اضطرابی کیفیت میں انگلیاں منہ میں دبالیں اور مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ میں کوئی ظالم یا جاہل ہوں۔ میرے خیال میں، ان لوگوں میں زیادہ سمجھدار میں تھا اس لئے بات مجھ تک آ پہنچی۔

فنکار اسٹیج پر موجود، اسٹیج اور کہانی پروڈیوسر کے ذہن میں تھی۔ مرکزی خیال کے تحت ہیرو کو خزانہ تک پہنچنا تھا۔ پروڈیوسر نے کہانی کا پلاٹ سنانے کے بعد سب سے پوچھا کہ کیا تم اپنے کردار ادا کرلو گے۔

پروڈیوسر معروف تھا لہٰذا اس کہانی میں کردار ملنا عام بات نہیں تھی۔ البتہ حیران کن طور پر ہیرو کا کردار ادا کرنے کے لئے کوئی راضی نہیں ہوا۔ تفصیلات سن کر چہروں کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

پروڈیوسر نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا، کیا تم ہیرو کا کردار ادا کرو گے؟

لیکن میں خزانہ تک کیسے پہنچوں گا؟ کیسے معلوم ہوگا کہ خزانہ کہاں چھپا ہوا ہے ــــ؟ لہجہ میں پریشانی تھی۔

خزانہ سے زیادہ اسٹیج پر کوئی شے تم سے قریب یا دور نہیں ہوگی۔ پروڈیوسر نے تجسس بڑھا دیا۔

اگر خزانہ اتنا قریب ہے پھر تلاش کرنے میں تگ و دو کیوں؟ آسانی سے مل جائے گا۔ میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ ہامی بھرتا پروڈیوسر نے مطلع کیا ــــ یہ بھی سن لو کہ کہانی جس اسٹیج پر چلے گی وہ فکشن ہے جہاں ہر شے کشش اور گریز کے اصول کے تحت بنائی گئی ہے۔ چیزیں اپنی طرف کھینچیں گی تو تم رنگوں میں کھو کر خزانہ سے دور ہو جاؤ گے اور کردار مشکل اور پیچیدہ ہو جائے گا۔

پروڈیوسر کی آنکھوں میں پُراسرار چمک تھی۔ میں نے آس پاس فنکاروں کی طرف دیکھا۔ سب خاموش میرے فیصلہ کے منتظر تھے۔

ہامی بھرنے سے پہلے پوچھا کہ جب میں اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کروں گا تو پھر ڈریکسا! کیا میں خود کوئی فیصلہ لے سکتا ہوں۔ میرے پاس اختیار ہوگا؟

بتایا گیا کہ تمام کردار اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کرنے اور قواعد وضوابط کے پابند ہیں۔ اگر کوئی اس کو اختیار سمجھ لے تو اس پر پابندی نہیں، ہر ایک اپنے طرز عمل کا جواب دہ ہے۔

یہ کیسی بات ہے! کہانی کا حصہ بھی بننا ہے اور جواب دہی بھی—؟

پروڈیوسر نے کہا، اسٹیج کا فکشن یہی بتائے گا کہ تمہارے پاس ہر طرح کا اختیار ہے۔ کئی عوامل درپیش ہوں گے جو تمہیں خزانہ سے دور یا قریب کرنے میں مدد دیں گے۔ تمام فنکار راضی ہیں لیکن مرکزی کردار ادا کرنے پر کوئی تیار نہیں۔ کہانی کئی اقساط پر مشتمل ہے اور اس وقت تک چلے گی جب تک تم خزانہ کو نہیں پا لیتے۔

میں سمجھا نہیں—؟

اگرچہ کہانی کے شروع اور ختم ہونے کا وقت مقرر ہے مگر منزل تک تم جلدی پہنچتے ہو یا دیر سے، اس کا تعین تم خود کرو گے۔ دیگر کردار تمہارے معاون ہیں اور حکم کے منتظر رہیں گے۔ جیسے چاہو ان سے کام لے سکتے ہو البتہ تم سے صحیح اور غلط پر جواب دہی کی جائے گی۔

اتنا شان دار کردار! دل میں سوچتے ہوئے فنکاروں پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ اپنے کردار کا تعین ہونے پر سب مطمئن تھے اور انہوں نے بخوشی اسے قبول کیا۔

کہانی میں ہیرو میں ہوں، ولن کون ہے—؟

پروڈیوسر بے نیازی سے بولا، تم اور کون!

دیگر فنکار میری حالت سے حظ اٹھا رہے تھے اور میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ حواس بحال ہونے کے بعد میں نے پوچھا کہ ہیرو ولن کیسے ہو سکتا ہے؟

مجھے بتایا گیا کہ ہیرو جب اپنے کردار سے غافل ہو تو ولن بن جاتا ہے اور خود کو نقصان پہنچاتا ہے۔

کہانی کس کے لئے فلمائی جائے گی۔ دیکھنے والے کون ہیں—؟ میں نے ذمہ داری قبول کرنے سے پہلے الجھے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

تماشا تم کرو گے اور تماشائی بھی تم ہو گے۔

مجھے پانچ سو وولٹ کا جھٹکا لگا۔

یہ بھی سن لو کہ تم اسٹیج پر جاتے ہی ہمارے درمیان ہونے والی ہر بات بھول جاؤ گے۔

پھر اداکاری کیسے ہوگی—؟ میں اچھل پڑا۔

اس کی فکر مت کرو۔ یاد دلانا ہماری ذمہ داری ہے۔

پروڈیوسر کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ پھر اس نے کہا، اکثریت اسٹیج کے فکشن میں الجھ جائے گی لیکن کہانی حقیقت سے شروع اور حقیقت پر ختم ہوگی۔

تجسس پسند طبیعت نے کچھ دیر سوچا لیکن عجلت پسندی کی عادت کے سبب اندر میں آواز پر دھیان نہیں دیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

دیگر فنکاروں نے اضطرابی کیفیت میں انگلیاں منہ میں دبا لیں اور مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ میں ظالم یا جاہل ہوں۔ جب کہ میرے خیال میں، ان لوگوں میں زیادہ سمجھ دار میں تھا اس لئے بات مجھ تک آ پہنچی۔

کیمرا—لائٹ—ایکشن!

پروڈیوسر کی آواز کے ساتھ روشنی پھیلی اور تاریک اسٹیج نمایاں ہوگیا۔ اسٹیج حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا اور کیمرا، لائٹ اور ایکشن کہتے ہی متحرک ہوگیا۔ آس

پاس کردار اور میں حیران تھا کہ طلسمِ ہوشربا کی مانند یہ اسٹیج کہاں واقع ہے۔ ذہن کے پھیلنے اور سمٹنے کے سبب اسٹیج کی وسعت کم یا زیادہ ہوجاتی۔

میں ورطۂ حیرت میں گم تھا۔ پروڈیوسر کی تیکنیکی مہارت نقص سے پاک تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ اور مکمل۔ اسٹیج کی خصوصیت تھی کہ جو فرد جس نگاہ سے دیکھتا، اس کے لئے اپنی نگاہ منظر بن جاتی!

اسٹیج پر شمار میں آنے والے لاشمار فنکار موجود تھے۔ اسکرپٹ کے مطابق صلاحیتیں مخصوص تھیں۔ سب بخوشی اپنا اپنا کردار نبھا رہے تھے، ایک میں ہی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کہانی کی طلسم ربائی کے کیا کہنے! ایک کردار میں کئی کردار تھے اور یہ طریقۂ کار سب کے لئے مشترک تھا۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا — ایک فرد کسی کا باپ اور شوہر، کسی کا بھائی اور بیٹا تھا۔ وہی فرد کسی کا ماموں اور چچا، کسی کا بھانجا اور بھتیجا تھا۔ کہیں پر شاگرد اور کہیں پر استاد تھا۔ گھر پر سربراہ اور آفس میں ملازم تھا۔ کوئی اس کا ماتحت تو کہیں وہ کسی کا ماتحت تھا۔

حالات کے لحاظ سے ایک کردار کے کئی کردار تھے۔ کرداروں کے مزاج میں اتار چڑھاؤ نے کہانی کو کئی رخ دے دیئے تھے۔ میرے قبیلہ کے افراد کبھی ہنستے اور افسردہ ہوتے، کبھی غربت اور مجبوری کا رونا روتے اور کبھی فراخ دلی کا چولا پہن لیتے۔

مجھے اپنے کردار اور اس کے گرد گھومنے والی کہانی کو سمجھنا تھا۔ گہرائی میں دیکھنے سے اسکرپٹ کا منشا واضح ہونے لگا کہ میرے قبیلہ کے اداکار فکشن میں الجھ کر مصنف کی کہانی کو اپنی لکھی ہوئی کہانی سمجھ بیٹھے ہیں۔ بایں سبب فکشن کا قانون حرکت میں آنے سے طلسم زاویۂ نظر بن گیا۔ اس کے برعکس دوسرے قبیلوں کے کرداروں نے خود کو کردار ہی سمجھا اس لئے شاد باد اور خوش وخرم رہتے تھے۔

ہر اسٹیج کہانی کے پیچھے پردہ ہوتا ہے جہاں سے فنکاروں کو ہدایات ملتی ہیں۔ کردار ادا کرنے کے بعد فنکار پس پردہ ہوجاتے ہیں۔ پردہ کے پیچھے سے آنا اور واپس چلے جانا — روز کی زندگی تھی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ پردہ کے پیچھے کا راستہ بشمول میرے، ہر فنکار کے اندر سے کھلتا تھا اور میں اسے باہر تلاش کرتا رہا۔ حیران تھا کہ باہر نظر آنے والے وسیع اور لامتناہی حدوں تک پھیلے ہوئے اسٹیج سے مماثل اسٹیج میرے اندر بھی موجود تھا۔

پروڈیوسر اور اپنے درمیان گفتگو میں بھول گیا تھا اس لئے حیرت ہوتی کہ اسٹیج کس نے بنایا ہے،

کردار کیا اور کون ہیں،

کہاں سے آتے اور کہاں چلے جاتے ہیں؟

اندر میں آواز کہتی تھی کہ میں اس کہانی کا مرکزی کردار ہوں اور خود کو ہیرو ثابت کرنے کے لئے مجھے خزانہ تک پہنچنا ہے۔ ذوق وشوق بڑھنے سے ذہن

اسٹیج کے فکشن سے ہٹنا شروع ہوا۔

تھکن سے چور جب میں سوجاتا تو بستر پر ہونے کے باوجود خود کو دور دراز سفر کرتے ہوئے دیکھتا، کھاتا پیتا، باتیں کرتا اور اپنے اردگرد دنیا دیکھتا تھا۔ غور وفکر سے حقیقت آشکار ہوئی کہ اسٹیج کی خصوصیت چیزوں میں تغیر ہے اور تغیر الوژن ہے۔ تغیر کی نشان دہی کے بعد مجھے حقیقت کو تلاش کرنا تھا۔ اس میں وقت لگا— وقت کے بغیر کام ممکن نہیں۔

پھر ایک مبارک دن خزانہ مل گیا!

خزانہ کیا— حیرت کا لامتناہی سمندر تھا جو میرے اندر رکھا گیا تھا۔ ناواقفیت نے اس خزانہ کو دور سمجھا اور واقفیت نے خود سے قریب پایا۔ خزانہ تک پہنچتے ہی کرداروں کے دھندلے چہرے نمایاں ہوئے یہاں تک کہ میں نے خود کو سب کے اندر اور سب کو اپنے اندر دیکھا۔ ان کا ریکارڈ میرے اندر اور میرا ریکارڈ ان کے اندر محفوظ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

روپ بہروپ کے اس اسٹیج میں لیلیٰ بھی میں اور مجنوں بھی میں تھا۔ ایک روپ میں مفلس اور دوسرے میں امیر تھا۔ کہیں پر ظالم اور کہیں مظلوم تھا۔ کہیں گدا تو کہیں بادشاہ، کہیں محبوب اور کہیں رقیب تھا۔ بااختیار لیکن بے اختیار تھا۔ خزانہ کو ڈھونڈ رہا تھا اور خزانہ بھی میں خود تھا۔

ہر چیز اسٹیج پر بنی اسکرین پر ظاہر ہوکر غائب ہورہی تھی۔ اسٹیج پر کھڑے ہونے سے کہانی کا خیال ذہن سے نکل جاتا اور میں اختیار کو حقیقت سمجھتا— یہی سوچ دراصل فکشن تھی۔ اس فکشن کو مشاہداتی طرزوں میں دیکھنا باقی تھا۔

کہانی کا ایک حصہ مکمل ہونے پر اسٹیج سے پردہ ہٹنا شروع ہوا اور ہال تالی کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں دم بخود تھا— اسٹیج کے اس پار— تماشائیوں کی کرسی پر میں پُرجوش انداز سے تالیاں بجا رہا تھا۔

ہست — نیست

کسی نے بزرگ سے سوال کیا کہ دونوں جہانوں کی کیا حقیقت ہے؟ بزرگ نے فرمایا، دونوں جہاں باوجود اتنی بلندیوں اور پستیوں کے پانی کا ایک قطرہ ہیں۔ ان کا ہست میں شمار ہے نہ نیست میں۔ انہیں موجود کہا جاسکتا ہے اور نہ معدوم۔ یہ قطرۂ آب سے ظاہر ہوئے۔ اتنے نقش ونگار کے باوجود ان کی حقیقت پانی کا ایک قطرہ ہے۔ جس عمارت کی بنیاد پانی پر رکھی گئی ہو، وہ عمارت خواہ لوہے کی کیوں نہ ہو آخرکار بوسیدہ ہوجائے گی۔ کوئی چیز لوہے سے سخت نہیں ہوتی۔ غور کرو جب خود پانی پائیدار نہیں تو اس پر کھڑی عمارت کا کیا حشر ہوگا؟

عبدالوحید نظامی

ڈائی مینشن

نقطہ مائیکرو فلم ہے۔ مائیکرو فلم کا مطلب یہ ہوگا کہ اسپیس پر کسی نہ کسی شے کا مظاہرہ ہوگا۔ نقطہ کے اندر کائنات بند ہے۔ نقطہ کھلتا ہے تو.....

ڈائی مینشن کیا ہے ــــ؟

روحانیت دو بنیادی علوم پر مشتمل ہے۔

۱۔ علمِ لوح ۲۔ علمِ قلم

دونوں علوم کائنات کی رگِ جان ہیں۔ ان علوم کی طرزیں سائنسی علوم کی بنیاد بنتی ہیں۔ نقطہ، زاویہ، مربع، مستطیل، مکعب، دائرہ وغیرہ سب قلم اور لوح کے مظاہرے ہیں۔ قلم جب لوح سے ٹکراتا ہے، اس کی پہلی شکل ہمیشہ نقطہ بنتی ہے اور نقطہ کی تکرار لکیر بن جاتی ہے۔ جب دو لکیریں آپس میں ملتی ہیں تو زاویہ بن جاتا ہے۔ زاویہ کی لکیریں ایک دوسرے سے متوازی یعنی چار بن جائیں تو بننے والی شکل مربع یا مستطیل کہلاتی ہے۔ جب اسی مربع شکل میں بلندی اور پستی شامل ہوجائے تو یہ 12 عدد لکیریں بن جائیں گی۔ ہر لکیر ایک پیمائش اور ڈائی مینشن ہے۔

انجینیئرنگ میں پیمائش یا ڈائی مینشن کے اصول کے مطابق ایک لکیر پہلی ڈائی مینشن یا 1-D کہلاتی ہے۔ جب چار لکیریں ایک دوسرے کے متوازی آجائیں تو یہ 2D (ڈائی مینشن) ہے۔ اس کو مربع یا مستطیل کہتے ہیں۔ جب اسی مربع شکل میں بلندی اور پستی شامل ہوجائے تو یہ 12 لکیریں بن جاتی ہیں۔ اس کو 3D یعنی سہ جہتی کہا جاتا ہے۔

انجینیئرنگ میں اگر پیمائش فٹ کے اندر ہے تو پہلی لائن کو رننگ فٹ، چار لکیروں کو مربع فٹ اور بارہ لکیروں کو مکعب فٹ کہتے ہیں۔ لوڈو کے کھیل میں پھینکے جانے والے پانسے پر چھ تک ہندسے لکھے ہوتے ہیں۔ چھ ہندسے اصل میں چھ سمتیں ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، بلندی اور پستی۔ اگر لوڈو کے پانسے کی سمتوں میں بننے والے ہر کونے کو ختم کردیا جائے تو پانسا گولائی میں تبدیل ہوجائے گا۔ گول چیز یعنی فٹ بال، گیند، سورج اور چاند کے نظر آنے والے جسم کی پیمائش 360 زاویوں پر رکھی جاتی ہے۔

علم چاہے سائنس کا ہو یا روحانیت کا ــــ ایک جسم کا دوسرے جسم سے فاصلہ ڈائی مینشن کہلاتا ہے۔ اگر

ڈائی مینشن کی پیمائش آدمی کے بنائے گئے اعداد پر ہے تو اس کو انجینیئرنگ یا سائنس کہتے ہیں۔ مثلاً کلو میٹر، میل، میٹر، فٹ یا انچ اگر اجسام میں نہ ہوں تو خلا یا اسپیس کا علم روحانی دائرہ میں آجاتا ہے اور اس دائرہ میں ڈائی مینشن زیر بحث نہیں آتی کیوں کہ ڈائی مینشن ہمیشہ دو کی موجودگی کے سبب ہوتی ہیں۔

جسم ڈائی مینشن پر مشتمل ہے۔ مثلاً قد، وزن، رنگ، خدوخال، نقش ونگار وغیرہ۔ اس لئے آدمی خلا (اسپیس) کی لامحدود وسعتوں کو نہیں سمجھتا۔

جسم کے اندر اور باہر خلا ایک ہے۔ جسم خلا سے گزر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مسامات سے پانی داخل ہوتا ہے اور انہی مسامات سے خارج ہوجاتا ہے۔ جسم میں خلا نہ ہو — سانس، ہوا، پانی، خوراک داخل و خارج نہیں ہوتی۔ ڈائی مینشن، مقداریں، وزن اور حجم خیالات کے ذریعے بنتے اور بکھرتے ہیں۔ خیال کا علم حاصل کرلیا جائے تو فرد ڈائی مینشن کی حقیقت سے واقف ہوجاتا ہے اور اسے بنتا اور بکھرتا دیکھتا ہے۔

ڈائی مینشن کی بنیاد لکیریں ہیں۔ لکیروں کے تناسب سے نئی نئی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ لکیریں مغلوب ہوتی ہیں تو صورتیں غائب ہوجاتی ہیں۔

''وہ تمہاری ماؤں کے رحموں میں جیسی چاہتا ہے صورتیں بناتا ہے۔'' (اٰل عمران: ۶)

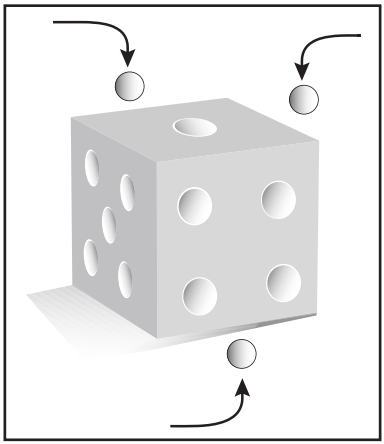

ڈائی مینشن کی حقیقت سے واقفیت کے لئے نقطہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''نقطہ ایسی ڈائی مینشن ہے جس میں اول آخر ظاہر اور باطن ایک ہیں۔ نقطہ مائیکرو فلم ہے۔ مائیکرو فلم کا مطلب یہ ہوگا کہ اسپیس پر کسی نہ کسی شے کا مظاہرہ ہوگا۔ نقطہ کے اندر کائنات بند ہے۔ نقطہ کھلتا ہے —؟''

واضح ہوتا ہے کہ نقطہ کے بعد جو بھی ڈائی مینشن ہوگی اس کے تناسب میں فرق ہوگا اور وہ کسی نہ کسی طرح تکون میں ہوگی۔ نقطہ — غیب اور شہود کے درمیان پردہ ہے۔ نقطہ کی تعریف کی جاتی ہے کہ اس میں لمبائی، چوڑائی اور موٹائی نہ ہو۔ یہ سب ڈائی مینشن ہیں۔ گویا نقطہ ایسا ادراک ہے جو غیب کی نشان دہی کرتا ہے۔ غیب کے علم کا ایک رخ لوح اور دوسرا قلم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم کا علم انسان کو عطا کیا ہے۔

مقداریں کیا ہیں ــــ؟

خاتون کے چہرہ کی ساخت اور بلی نما آنکھیں عکاسی کرتی ہیں کہ آنکھ پر جس چیز کا نقش زیادہ بنتا ہے اس کے اثرات مستقل منتقل ہونے سے گہرے ہوجاتے ہیں۔

بنی اسرائیل وہ قوم ہے جسے اللہ نے نعمتوں اور معجزات سے نوازا مگر ناعاقبت اندیش لوگوں نے نعمتوں کی ناقدری کی اور ماضی کی نافرمان اقوام کی طرح اپنے انجام کا سبب خود بنے۔ تاریخی ادوار کو ہم قصہ کہانیوں کی طرح پڑھتے ہیں اور ان کو ماضی سے منسوب کرکے سبق نہیں لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور گزرے ادوار کا آئینہ ہے، کردار بدل جاتے ہیں جس سے کہانی کے تبدیل ہونے کا گمان ہوتا ہے لیکن کہانی ایک ہے۔

بنی اسرائیل کو سنیچر کے احترام کی تاکید کی گئی تھی۔ حکم تھا کہ ہفتہ کے دن عبادت کریں اور دنیاوی مشاغل ترک کرنے کے ساتھ مچھلیوں کے شکار سے گریز کریں۔ حضرت داؤدؑ کے عہد میں لوگوں نے حل یہ نکالا کہ جمعہ کے دن دریا کنارے گڑھے کھودے اور نالیاں بنائیں جن میں دریا کا پانی جمع ہوتا کہ پانی کے ساتھ مچھلیاں بھی گڑھوں میں آجائیں۔ ایسا ہی ہوا۔ جمعہ اور ہفتہ کو جو مچھلیاں گڑھوں میں آئیں، ان لوگوں نے اتوار کے روز وہ مچھلیاں پکڑیں اور یہ عمل معمول بن گیا۔ حضرت داؤدؑ نے لوگوں کو تنبیہ کی کہ یہ طرزِ عمل درست نہیں لیکن لوگ باز نہیں آئے۔

مسلسل نافرمانی سے چہروں پر نحوست چھانے لگی، جسم پر بال بڑھ گئے یہاں تک کہ شکلیں مسخ ہوکر بندر نما ہوگئیں۔ عقل و حواس قائم رہے لیکن قوت گویائی ختم ہوگئی۔ جسم سے بدبو کے بھپکے اٹھے اور نافرمان لوگ تین روز تک روتے روتے مر گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد تقریباً ستّر ہزار تھی۔

''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔'' (البقرۃ: ۶۵)

محترم قارئین! ہر عمل شکل وصورت رکھتا ہے۔ شکل مقدار ہے، مقدار رنگ اور رنگ روشنی ہے۔ عمل میں سکون کی طرزیں ہوں تو چہرہ کھل اٹھتا ہے، ناکامی و

افسردگی ذہن پر طاری ہوجائے تو آنکھوں میں چمک ماند اور چہرہ زردی مائل ہوجاتا ہے۔

بنی اسرائیل میں نافرمانی کا اظہار تعفن کے بھپکوں اور بندروں کی شکل میں ہوا۔ نافرمانی سے مقداروں میں بگاڑ پیدا ہوا یہاں تک کہ شکلیں بدل گئیں۔

آدمی کا مچھلی کھا کر بندر کی صورت ہونا ایسا امر ہے جس میں طرزِ عمل کے اثرات کے ساتھ تین نوعوں کی مقداریں زیر بحث آتی ہیں۔ مچھلی فاسد المزاج اور بدبودار ہے اور بندر کے جسم پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے جب بنی اسرائیل نے مچھلیاں کھانا شروع کیں اور مچھلی کی مقدار ان کی خوراک میں بڑھی تو مچھلی کے مزاج کا فساد اور بدبو ان کے اندر سرایت کر گئی اور ان عناصر کی مقدار یہاں تک بڑھی کہ جسم مثالی میں بگاڑ پیدا ہوا، نتیجہ میں چہرے مسخ ہوگئے۔

تعفن کثافت کا نتیجہ ہے۔ کثافت کے اخراج کا ایک ذریعہ جسم پر بالوں کا نکلنا ہے۔ کثافت سے جسم پر بالوں کی زیادتی ہوتی ہے اور بال تیزی سے بڑھتے ہیں۔ یہی حال اس قوم کا ہوا کہ تعفن سے عضلات سکڑے، چہرہ کی ساخت بدلی اور بڑے بڑے بال نکل آئے۔

ساخت اور چہرہ پر تاثرات جسم مثالی کا عکس ہیں جو روشنی کا جسم ہے اور مٹی کے جسم سے نو انچ کے فاصلہ پر ہوتا ہے۔ واقعہ میں عبرت ہے کہ نافرمانی سے مقداروں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

مچھلی حلال ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کچھ وقت کے لئے کھانے سے منع فرمایا تو اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے بعد وقت مقررہ تک غذا حرام ہوگئی۔ حلال خوراک سے جو توانائی بنتی ہے اس میں تبدیلی آ گئی۔ یہ تبدیلی بڑھتے بڑھتے انتہا کو پہنچی، جسموں پر بندروں کی طرح بال نکل آئے اور ذلت و رسوائی مسلط ہوگئی۔

مخلوق مقدار کے علاوہ کچھ نہیں۔ فرد اس بات کو جان لے کہ اس کا ہر عمل اور ہر لفظ مقدار ہے اور مقدار کے اثرات مظہر بنتے ہیں تو وہ احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھے گا۔

ایک خاتون کو بلیاں پالنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس 35 بلیاں تھیں۔ بلیوں سے انسیت بڑھنے سے چہرہ کی ساخت بلی نما اور آنکھیں گول ہوگئیں۔ دیکھنے والوں کو چہرہ پر بلی کی جھلک نظر آتی۔ ان کے شوہر سے ملاقات ہوئی تو گھر میں بلیاں ہونے کی وجہ سے شوہر نے بھی اس اثر کو قبول کیا۔ خاتون کے یہاں یکے بعد دیگرے چار بچوں کی پیدائش ہوئی۔ بچوں کے چہرہ کی ساخت اور آنکھوں میں ماں کا تاثر تھا۔

بچے جوان ہوئے۔ خاتون بیرون ملک چلی گئیں اور بلیاں یہیں رہ گئیں۔ دوسرے ملک کاروبار حیات میں مصروفیت کے سبب بلیاں پالنے کا شوق پورا نہ ہوسکا اور جو بلیاں پیچھے چھوڑ گئی تھیں، وہ ان کے بغیر ایک کے بعد ایک مر گئیں۔ آٹھ سال بعد وطن واپسی ہوئی تو بلیوں کا خیال بہت حد تک ذہن سے نکل گیا۔ ماحول بدلنے سے

چہرہ پر فرق ظاہر تھا۔ بلیوں سے قربت نہ ہونے کی وجہ سے تاثر (رنگ) تقریباً زائل ہوگیا۔

خاتون کے چہرہ کی ساخت اور بلی نما آنکھیں عکاسی کرتی ہیں کہ آنکھ پر جس چیز کا نقش زیادہ بنتا ہے، اس کے اثرات مسلسل منتقل ہونے سے گہرے ہوجاتے ہیں۔ بندہ کا اپنا تشخص پس پشت چلا جاتا ہے اور جس کا تصور ہوتا ہے، اس کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔ بلیاں ان کی شخصیت کا حصہ بن گئیں۔

نافرمانی اور فرماں برداری کی طرح انسیت بھی مقدار ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو کچھ عرصہ بعد ان کی طرح چلنا بولنا شروع کردیتے ہیں۔ اکثر گائیکوں کو سن کر پتہ چل جاتا ہے کہ ان کا استاد کون ہے یا وہ کس کی گائیگی پسند کرتے ہیں۔ شاگرد میں استاد کے طرزِ عمل کا ظاہر ہونا بتاتا ہے کہ اس نے استاد کی مقداریں قبول کرلیں۔

اللہ نے کائنات کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو فرمایا، ہوجا! ارادہ کے مطابق کائنات وجود میں آگئی اور حکم کے مطابق موجود ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے مقداروں سے تخلیق کی اور ان مقداروں کی ہدایت بخشی۔''

(الاعلیٰ: ۱۔۳)

ہر شے مخصوص مقداروں کا مجموعہ ہے۔ مقداریں ایک نوع کو دوسری نوع سے مختلف بناتی ہیں، اور نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ آدمی کی مقدار معین ہے۔ پودے، نباتات، جمادات اور دیگر نوعیں بھی الگ تشخص اور خدوخال رکھتی ہیں۔

جس فضا میں ہم سانس لیتے ہیں، یہ گیسوں کا خاص تناسب ہے جس کو برقرار رکھنے کے لئے قدرت نے قاعدہ ترتیب دیا ہے۔ بے قاعدگی واقع ہونے سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح پھل اور پھول کی مخصوص وضع قطع ہے۔ ان میں رنگینی کی وجہ مقداریں ہیں۔ بارش سے ہر مخلوق مستفید ہوتی ہے۔ آدمی، چوپائے، کیڑے، پہاڑ اور پودے سب ایک پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ہر پودے کے اندر پانی جذب کرنے کی صلاحیت مختلف ہے، کسی کو کم پانی کی ضرورت ہے، کسی کی نشوونما کے لئے زیادہ پانی درکار ہے۔ نتیجہ میں پھل پودوں کی مقدار میں فرق آتا ہے اور یہی مقداریں ایک پھل کو زرد تو کسی کو سبز بنادیتی ہیں، کوئی ترش، میٹھا اور کوئی کڑوا ہوتا ہے۔

چاند کے آسمان پر لکیر کی صورت میں ظاہر ہونے اور بتدریج بڑھنے سے چاند ماہ کامل بن جاتا ہے — پھر چاند گھٹنے لگتا ہے اور زمین کے گرد 27 دنوں میں چکر مکمل کرتا ہے جس سے ماہ وسال کا شمار ہوتا ہے۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا اور مدار میں رہتے ہوئے زمین کے گرد چکر پورا کرنا مقداروں کی بدولت ہے۔

ایٹم میں نیوٹران، الیکٹران اور پروٹان کی مخصوص تعداد ہوتی ہے۔ کمی بیشی سے ایٹم کی ساخت تبدیل

ہوتی ہے ۔ہائیڈروجن کے ایٹم میں ایک اور آکسیجن کے ایٹم میں آٹھ الیکٹران ہوتے ہیں۔الیکٹران کی کمی یا زیادتی سے اب یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹم نہیں کہلائیں گے کیوں کہ مقداروں میں ردّوبدل سے ساخت کے ساتھ خصوصیات بھی بدل جاتی ہیں۔

ہم ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ہاتھ چاہے کتنی گرم جوشی سے ملایا گیا ہو، دوسرے ہاتھ میں جذب نہیں ہوتا کیوں کہ ہاتھ ایک ہونے کے باوجود دونوں ہاتھوں کی مقداریں الگ ہیں۔ بچہ کا وجود ماں سے بنتا ہے لیکن ماں اور بچہ ایک نہیں۔جسم میں پرورش پانے والا بچہ ماں میں جذب نہیں ہوتا،اس کی اپنی پہچان ہے۔

حرارت بھی مقدار ہے ۔مثلاً دودھ مقررہ حرارت پر بلونے سے مکھن حاصل ہوتا ہے ۔کم بلویا جائے تو مکھن نہیں نکلتا۔درجۂ حرارت میں اضافہ سے دودھ میں ڈلے بنتے ہیں۔ ڈلوں کو آگ پر پکانے سے گھی نکلتا ہے۔دودھ سے گھی اور مکھن نکلا، کیا گھی اور مکھن کو ملانے سے واپس دودھ بنے گا—؟

کروموسومز کی تعداد ہر نوع میں مختلف ہے۔یہ نوع کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔آدمی میں ان کی تعداد 46 یعنی 23 جوڑے، بندر میں 48، کتے میں 78 اور بلی میں 38 ہے۔ اسی لئے بلی سے بلی، بندر سے بندر اور آدمی سے آدمی پیدا ہوتا ہے ۔ مرد اور عورت میں کروموسومز کے 23 جوڑوں میں سے ایک جوڑے کا تناسب دونوں میں مختلف ہے جس کو سیکس کروموسوم کہتے ہیں۔خواتین میں یہ xx اور مردوں میں xy کہلاتا ہے۔مقداروں میں تغیر نہیں لیکن ان کے تناسب میں فرق سے شے تبدیل ہوتی ہے۔

جذبات واحساسات —خوشی غم ،نفرت محبت، دوستی دشمنی، معافی انتقام، حسد خیر خواہی سب مقداریں ہیں۔ ان مقداروں کی شکلیں ہیں۔جس صفت کو اختیار کریں گے، آپ کی شکل اس کے مشابہ ہوجائے گی۔

نوعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر نوع میں زندگی گزارنے کے تقاضے یکساں ہیں۔مثلاً بھوک، پیاس، سونے، جاگنے، افزائشِ نسل کا تقاضا مشترک ہے ۔ پھر نوع آدم کی افضلیت کیا ہوئی —؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پیدا کیا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ احسن تقویم مقداروں سے واقف ہوں۔اگر ہم واقف نہیں ہیں جیسا کہ نہیں ہیں تو کیا ہم احسن تقویم کی مقداروں میں ہیں—؟

مخلوق ہر حالت میں مقداروں میں بند رہتی ہے۔ سوچئے کہ پھر اپنی مقدار کو چھوڑ کر ہم نے کون سی مقدار کو قبول کیا ہے—؟ خصوصیات، عادات اور طرزِ عمل پر غور کیجئے کہ اگر آپ احسن تقویم کی مقداروں سے واقف نہیں ہیں تو پھر کون سی اور کس نوع کی مقداریں آپ پر غالب ہیں—؟

فضل حق قریشی

موئن جو دڑو

ہتھیاروں اور کھانے پینے کے برتنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے عہد عتیق میں پتھر کا زمانہ ختم ہو کر دھات کا زمانہ شروع ہو گیا تھا کیوں کہ یہاں سے دونوں قسم کے آلات اور ظروف برآمد ہوئے ہیں۔ ہتھیاروں میں کمان، برچھی، بھالے، کلہاڑیاں، خنجر اور گرز شامل تھے۔ صرف تلوار کی کسر تھی۔

موئن جو دڑو کے لوگ سونے، چاندی، تانبے اور سیسے کے استعمال سے واقف تھے لیکن لوہے کا علم نہیں تھا۔ سونے چاندی کے زیورات بناتے تھے۔ دونوں قیمتی دھاتیں جنوبی ہند کے ان مقامات سے لائی جاتی تھیں جو کولار اور اننت پور کے نام سے مشہور ہیں۔ تانبے کی درآمد بلوچستان اور ایران سے ہوتی تھی کیوں کہ بلوچستان میں کھدائی کے بعد بعض ایسی چیزیں دست یاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں اور وادی سندھ کے رہنے والوں میں خوب میل جول اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔

چوں کہ اس حصۂ زمین پر تانبا پتھر کی جگہ لے چکا تھا اس لئے خانگی ظروف اور ہتھیار اسی دھات کے بنتے تھے۔ غریب گھرانوں میں سونے کے بجائے تانبے کے زیورات پہنے جاتے تھے۔ خالص ٹین (قلعی) کے بجائے اس کو چھ سے تیرہ فیصدی کی نسبت سے تانبے میں ملا کر کانسی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ تسلیم شدہ ہے کہ تانبے کے مقابلہ میں کانسی کے بنے ہوئے ہتھیاروں کی دھار زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ٹین یا کانسی کی فراہمی شمالی ایران یا مغربی افغانستان سے درۂ بولان کی راہ سے عمل میں آتی تھی۔ کانسی کی چیزیں دیکھ کر بعض مؤرخین کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کانسی کے عہد کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

عمارتوں کی تعمیر میں دور و نزدیک سے منگا کر ہر قسم کا پتھر استعمال کیا جاتا تھا۔ کھیر تھر کی پہاڑیوں سے کھریا مٹی (چونے میں مل کر چنائی کے کام آتی تھی) کے علاوہ سنگ جراحت بھی لایا جاتا جس سے کھڑکیوں کی چلمنیں، جالی دار کٹہرے، بعض ظروف اور دیوتاؤں کی مورتیں تیار ہوتی تھیں۔ لعل بدخشان اور نیلم خراسان کے علاوہ پامیر، مشرقی ترکستان، تبت اور دیگر مقامات سے ایسے ایسے قیمتی پتھر منگائے جاتے جو اس زمانہ میں زینت و زیبائش کے ضمن میں سرمایۂ افتخار سمجھے جاتے تھے۔ ان جواہرات کے علاوہ ہاتھی دانت اور سیپ کی

بھی قدر رہوتی تھی۔

مختلف مکانات سے بے شمار تکلوں کا بر آمد ہونا تصدیق کرتا ہے کہ اس زمانہ میں کاتنے کا دستور عام تھا۔ امرا کے گھروں سے ہاتھی دانت کے قیمتی تکلے بر آمد ہوئے ہیں، اس کے برعکس غریب لوگ تانبے یا سینگ کے سستے تکلوں پر گزارا کرتے تھے۔ پارچہ بافی کے لئے اون اور روئی مستعمل تھیں۔

دریافت ہونے والے ایک نقرئی گل دان کے گرد لپٹی ہوئی سوتی کپڑے کی پٹیاں آج کل کے گاڑھے (موٹا سوتی کپڑا) سے بالکل مشابہ ہیں۔ قیاس ہے کہ اس زمانہ میں وادی سندھ کا بنا ہوا دیسی کپڑا دور دراز ملکوں تک پہنچتا تھا۔ چناں چہ بابل میں اسے سندھو اور یونان میں سندون کہتے تھے اور یہ الفاظ ''سندھ'' سے مشتق ہیں۔

موئن جودڑو سے ملنے والے دو بتوں کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملبوسات میں ایک لمبی شال بھی شامل تھی۔ مردوں کی داڑھیاں اور گل مچھے (چھوٹی مونچھیں) ہوتے تھے۔ نیز اہل سمیر کی طرح ان میں سے اکثر مونچھیں منڈوا دیتے تھے۔ عورتوں میں سے بعض اعلیٰ گھرانوں کی خواتین آج کل کے مغربی فیشن کی طرح سر کے بال کاٹتی تھیں۔ رقاصاؤں کی کانسی کی تین مورتیں دریافت ہوئی ہیں جن کے بال بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

خواتین کے زیورات میں مالائیں، چٹلے، گلو بند، انگوٹھیاں، پٹکے، بالیاں اور پازیب قابل ذکر ہیں۔ یہ زیورات چاندی، سونے اور ہاتھی دانت سے لے کر تانبے، کانسی اور سینگ کے بنتے تھے۔

ہتھیاروں اور کھانے پینے کے برتنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے عہد عتیق میں پتھر کا زمانہ ختم ہو کر دھات کا زمانہ شروع ہو گیا تھا کیوں کہ یہاں سے دونوں قسم کے آلات اور ظروف بر آمد ہوئے ہیں۔ ہتھیاروں میں کمان، برچھی، بھالے، کلہاڑیاں، خنجر اور گرز شامل تھے۔ صرف تلوار کی کسر تھی۔ جسمانی حفاظت کے لئے ایک زرہ بکتر بنایا گیا تھا۔ یہ آلات غالباً شکار کے سلسلہ میں استعمال ہوتے تھے کیوں کہ سامان حرب کی کمی ثابت کرتی ہے کہ ان میں لڑائی جھگڑے بہت کم ہوتے تھے اور نہ انہیں کسی دشمن کی چڑھائی کا خطرہ تھا۔ یہ لوگ کھیتی باڑی کے جملہ آلات اور بال مونڈنے کے لئے استرے استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کی دھاریں اس قدر تیز ہیں کہ آج بھی ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

موئن جودڑو سے ملنے والے تولنے کے باٹ بھی کافی دل چسپ ہیں۔ چھوٹی چیزوں کا وزن کرنے کے لئے سلیٹ کے مکعب نما ٹکڑے ہوتے تھے۔ البتہ زیادہ بھاری اشیا کے واسطے مخروطی قسم کے اوزان تھے۔

ترتیب وار دیکھا جائے تو ان کے اندر شروع میں

دوتائی اور اس کے بعد دہائیوں کی نسبت قائم تھی۔ مثلاً جو اوزان دست یاب ہوئے ہیں وہ 1، 2، 4، 8، 16، 32، 160، 320، 640 اور 1600 کی نسبت سے ہیں۔ ان میں سے 16 کی نسبت کا بٹّا سب سے زیادہ استعمال ہوتا تھا جس کا وزن تقریباً 13.71 گرام ہے۔ اگر پہلے بٹّے کو ایک چھٹانک تصور کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ قدیم تناسب آج بھی قائم ہے۔ یعنی چھٹانک، ادھ پئی، پوّا، ادھ سیر، دوسیری، دس سیری، من اور ڈھائی من۔

کھانے پینے کے برتن زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے ملے ہیں۔ آبخورے کی وضع کے ایک خاص برتن کے بے شمار ٹکڑے دست یاب ہونے پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ اس میں ایک بار پانی پی کر پھینک دیا جاتا تھا۔ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ غالباً وہی طریقہ اہل ہنود میں آج تک رائج ہے۔ ان برتنوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد کی ظروف سازی بھی کس قدر ترقی یافتہ تھی جن کو بنانے کے لئے کمہار کا چاک گردش میں رہتا ہوگا۔ ان میں سے بعض ایسے ظروف جو خصوصاً آرائش کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ان پر نقش و نگار، رنگوں سے پھول پتی بنانے نیز پختگی اور چمک کے لئے روغن چڑھانے کا دستور عام تھا۔

موئن جوداڑو کی باقیات میں ایک وسیع مکان سے جو شاید کسی متمول خاندان کا ''دولت کدہ'' ہوگا، زیورات کے بھرے ہوئے مرتبان نکلے ہیں جن کے نقش و نگار یا رنگ و روغن میں امتداد زمانہ کے باوجود فرق نہیں آیا۔

بچوں کے کھلونوں میں عام پالتو جانوروں کی شکلوں کے علاوہ چڑیاں اور گڑیاں بھی نکلیں جن کو سیٹی کے طور پر بجایا جا سکتا ہے۔ بعض پرندوں کے پنجوں میں پہیّے لگے ہوئے ہیں۔ لیکن مٹی کی ایک بیل گاڑی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے — وضع قطع کے اعتبار سے وہ اس رتھ سے بالکل مشابہ ہے جو عراق اور مصر کی سرزمین پر تین ہزار قبل مسیح میں استعمال ہوتی تھیں — بالفاظ دیگر موئن جوداڑو کے عہد کے بالکل ساتھ ساتھ۔

وادی سندھ کے لوگ فن تحریر سے واقف تھے۔ بعض مٹی کی تختیاں اور مہریں برآمد ہوئی ہیں جن پر جانوروں کی تصاویر اور الفاظ نقش ہیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود رسم الخط کے ماہرین ان کو پڑھنے سے قاصر ہیں حالاں کہ طرز تحریر کے اعتبار سے وہ بابل و نینوا کے خط میخی یا مصر کے ہیروغلافی خط (hieroglyphic) سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ تاہم اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ لوگ عبارت دائیں سے بائیں جانب لکھتے تھے۔

1867ء کا ذکر ہے، قدیم زبانوں کے ماہر ای تھامس نے خیال پیش کیا تھا کہ آریاؤں نے خانہ بدوشی کے دوران کوئی رسم الخط ایجاد نہیں کیا بلکہ ہندوستان پہنچ کر جب انہوں نے مستقل قیام کا تہیہ کر لیا تو وہیں کا طریقۂ تحریر اختیار کیا۔

اس وقت اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار

نہیں تھا کیوں کہ تمام مؤرخ اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ آریاؤں کی آمد کے وقت شمالی ہند میں صرف دراوڑی قومیں آباد تھیں اور یہ لوگ خود خانہ بدوش اور غیر مہذب تھے۔ موئن جودڑو کی کھدائی کے بعد جب یہ مغالطہ دور ہو گیا تو ای تھامس کے خیال کو پروفیسر لانگڈن نے وثوق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ وہ برہمن رسم الخط جس میں وید اپنی ابتدائی حالات میں لکھی گئی تھی، درحقیقت وادی سندھ کے خط اشکالی سے مشتق ہے۔ لہٰذا وہ دن دور نہیں جب تمام مٹی کی تختیاں اس زمانہ کی مروجہ زبانوں کی طرح پڑھ لی جائیں گی۔

مہروں کے علاوہ بعض برتنوں، تانبے کی پیٹیوں اور چوڑیوں پر بھی الفاظ کھدے ہوئے ہیں۔ اقسام کے اعتبار سے ان نشانات کی جواب تک دیکھے گئے ہیں کل تعداد 396 ہے۔ الفاظ کی کثیر تعداد سے گمان ہوتا ہے کہ بعض قدیم زبانوں کی طرح اس میں بھی حروف ابجد کا فقدان ہے اور وہ محض صوتی اعتبار سے لکھی جاتی تھی۔ بعض مہروں پر مفرد الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے۔ نیز اعراب اور دائروں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے تلفظ میں تبدیلی پیدا کی جاتی تھی۔

مسلک واعتقاد کے ضمن میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ موئن جودڑو کے رہنے والے کس مذہب کے پیروکار تھے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی ان کا شعار تھا کیوں کہ بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیں عبادت گاہوں سے برآمد ہوئی ہیں۔ بتوں کو دیکھ کر فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ ہندومت اس زمانہ کے اعتقاد کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

ویدوں میں اور خصوصاً رگ وید میں جن دیوتاؤں کا ذکر ہے اور جو ہیئت اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ موئن جودڑو کی مورتوں سے بالکل مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک مٹی کی تختی پر ایسے دیوتا کی شبیہ ہے جس کے تین منہ اور چھ آنکھیں ہیں۔ سر پر دو بڑے سینگ ہیں اور وہ یوگی کی طرح تخت پر آسن جمائے بیٹھا ہے۔ دائیں طرف ہاتھی اور شیر بائیں طرف گینڈے اور بھینس اور تخت کے سامنے دو سینگوں والے ہرن کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ وہ یقیناً سب دیوتاؤں کی ماں ہو گی۔ رام پرشاد چندا نے اگست 1932ء کے ''ماڈرن ریویو'' میں لکھا ہے کہ'' وہ چار ہاتھوں والا دیوتا جس کی تصویر موئن جودڑو کے نوادرات میں موجود ہے، بلاشبہ عہد قدیم کا برہما یا وشنو ہے۔''

یہ لوگ مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ پتھر کے ٹکڑوں پر بنے ہوئے نقوش سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیز مٹی کی اکثر تختیوں پر سانپ، بیل، شیر، بھینسے، مینڈھے، ہاتھی اور بندر کی مورتیاں دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کی پوجا کرتے تھے۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ موجودہ ہندومت کے تانے بانے موئن جودڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں سے ملتے ہیں۔ مورتیوں کے سلسلہ میں ان جانوروں کا ذکر دلچسپی

سے خالی نہیں ہو گا جن کو جسمانی اعتبار سے عجیب الخلقت کہا جاتا ہے اور جن کا صنمیاتی تصور یونان و روما کے اساطیر الاولین میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً بیلوں، بکروں مینڈھوں اور ہاتھیوں کی ایسی مورتیاں ملی ہیں جن کے چہرے آدم زاد اور باقی جسم حیوانی ہے۔

درختوں اور درختوں پر رہنے والی دیویوں کی پوجا کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ موئن جودڑو سے برآمد ہونے والی ایک مٹی کی تختی خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس پر دکھایا گیا ہے کہ ایک دیوی درخت کی شاخوں کے درمیان کھڑی ہے اور اس کے سامنے عورتیں عجز و انکساری کے ساتھ جھکی ہوئی پوجا میں مصروف ہیں۔ کمر تک لہراتی لمبی چوٹیوں سے صنف کا پتہ ملتا ہے۔ درختوں میں سے صرف پیپل کو مقدس سمجھا جاتا تھا کیوں کہ اس کے علاوہ کسی اور درخت کا نشان کسی چیز پر نہیں ملتا۔

یہ لوگ مُردوں کو جلاتے تھے۔ بعض ظروف میں سے ہڈیوں کی راکھ کے علاوہ ایسی چیزیں نکلی ہیں جو متوفی کی آئندہ زندگی کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ بعض برتنوں میں رسمی اشیا موجود تھیں مگر راکھ کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ مُردوں کو جلانے کے بعد ہڈیوں کی راکھ وغیرہ کو دریا میں بہا دیتے تھے جیسا کہ اب بھی دستور ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ ان لوگوں میں مُردوں کو دفن کرنے کی رسم بھی رائج تھی کیوں کہ تمام اضلاع کی کھدائی کے بعد آدم زاد کے 21 مکمل ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں یہ رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ یہاں اچانک تباہی کے بعد کچھ لوگ ملبے تلے دب کر زندہ درگور ہو گئے تھے۔ کیوں کہ کمروں کے اندر یا بازار میں دکانوں سے ان کا برآمد ہونا ظاہر کرتا ہے کہ باقاعدہ طور پر ان کی تدفین نہیں ہوئی بلکہ وہ کسی حادثہ کے تحت وہاں پڑے رہ گئے۔

ڈھانچوں کو دیکھ کر کاسۂ سر اور استخوان کہنہ کے ماہرین نے فیصلہ کیا ہے کہ موئن جودڑو کے باشندے مخلوط النسل تھے کیوں کہ ان کی کھوپڑیوں کا پیمائشی تناسب یکساں نہیں۔ نیز بعض کی ناکیں ستواں اور بعض کی چپٹی ہیں۔ اکثر بھیل اور کول سے مشابہ ہیں، کچھ موجودہ گجراتیوں، مرہٹوں اور بنگالیوں سے ملتی ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے ہزاروں سال پہلے کچھ قبیلے شمال و مغرب کے مختلف ممالک سے آکر وہاں آباد ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کولہی اور آریاؤں کے بجائے ان متقدمین نے وہاں کی اصل دراوڑی قوموں کو جنوب کی طرف مار بھگایا ہو۔

بے شک محکمہ آثار قدیمہ نے اس عظیم الشان بستی کے ایک مختصر حصہ کی کھدائی کر کے غور و فکر کی نئی راہ کھولی ہے لیکن بیش تر حصہ اب بھی زیر زمین ہے۔

(آخری قسط)

سرورق کی تشریح

سنا تھا کہ تصویریں بولتی ہیں۔ ''ماہنامہ قلندرشعور'' نے بتایا کہ تصویروں میں پنہاں مفہوم بولتا ہے۔

''ماہنامہ قلندرشعور'' کے سرورق میں گہرائی ہے ــــ ہر تصویر خود اپنی ترجمان ہے۔ تھوڑی دیر بغور دیکھیں تو ذہن ماحول سے ہٹ کر تصویر میں داخل ہوجاتا ہے۔ مئی 2019ء کے سرورق پر مناظر، اس پر لکھی گئی تحریر کا عکس ہیں۔

''زمین اسکرین ہے جس پر تخلیقات کا عکس منعکس ہوتا ہے۔''

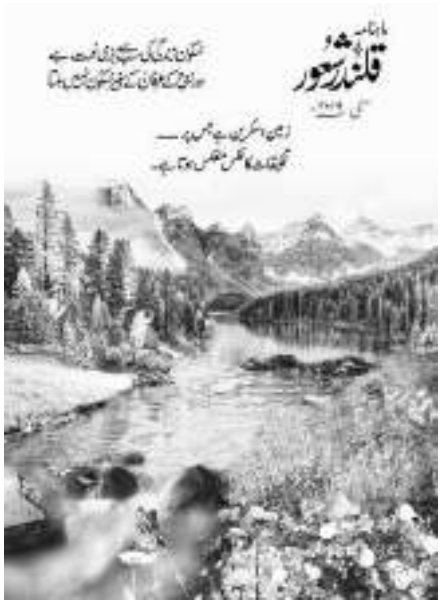

عکس دیرپا نہیں ہوتا، ظاہر ہوکر غائب ہوجاتا ہے۔ اسکرین پر نقوش کہاں سے آرہے ہیں، ان کی ترتیب ہم اسکرین پر دیکھتے ہیں یہ کس فارمولے پر قائم ہے کہ شعاعوں کے ذریعے آنے والے مختلف رنگ ایک جگہ جمع ہوکر متفرق نوعوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں؟ اسکرین پر پھیلنے والی روشنی گڈمڈ نہیں ہوتی، سب کو اپنے منعکس ہونے کی جگہ معلوم ہے۔ درخت کے رنگ جب زمین کی اسکرین پر نزول کرتے ہیں تو ان کا مظاہرہ اپنے مقام یعنی میدان، سبزہ، باغ یا پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ ہر لہر، ہر لکیر اور ہر رنگ کی جگہ مخصوص ہے۔ خالق کائنات اللہ کے سوا کون ہے جو اس منظّم نظام کا مالک ہے! اللہ نے ہر شے تناسب میں پیدا کی ہے اور ان کے ظاہر ہونے کی جگہ بھی مخصوص فرمادی ہے۔ اسکرین پر عکس کا منعکس ہونا ــــ اطلاع کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہم اطلاع کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ ہمارا عکس اطلاع میں موجود ہے اور اطلاع اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود کائناتی پروگرام کا عکس ہے۔ (مدیحہ سہیل۔ لاہور)

مئی 2019ء کے سرورق میں حسن و جمال اور ندرت ہے۔ خوب صورت منظر کشی پر شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کی نظم ''ایک آرزو'' ذہن میں آ گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

سرورق پر تحریر ہے کہ ''زمین اسکرین ہے جس پر — تخلیقات کا عکس منعکس ہوتا ہے''۔

تحریر کا مطلب ہے کہ تخلیقات حقیقت میں کہیں اور موجود ہیں اور ان کا عکس زمین پر منعکس ہوتا ہے۔

مثال: ہم سمجھتے ہیں کہ منظر سامنے ہے جب کہ روشنی آنکھ کے ذریعے دماغ میں داخل ہو کر تصویر بناتی ہے اور ہم تصویر کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔ اس نکتہ میں اشارہ ہے کہ ہم منظر نہیں بلکہ منظر کا عکس دیکھتے ہیں۔

یہی مثال زمین کی ہے کہ اشیا کہیں اور موجود ہیں لیکن ان کا عکس جس مقام پر پڑ رہا ہے اسے ہم زمین کے نام سے جانتے ہیں۔ البتہ عکس میں موجود خوب صورتی ہمیں جمال کے احساس سے روشناس کرتی ہے،

سرور کائنات رسول پاکؐ کا ارشاد گرامی ہے، ''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

بلاشبہ مئی 2019ء کے سرورق میں گوناگوں رموز ہیں جنہیں بیان کرنے کے لئے صفحات ناکافی ہیں۔

(محمد حسین۔ پشاور)

زمین اسکرین ہے۔ اس پر موجود ہر تخلیق کہیں سے یہاں پر مظہر (display) بن رہی ہے۔ زمین کی اسکرین پر چلنے والے پروگرام کا main server کہیں اور ہے — یہاں صرف عکس منعکس ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق دنیا کی زندگی کچھ نہیں صرف دھوکے کا سودا — آنکھوں کا فریب ہے۔ یعنی جو کچھ اسکرین پر منعکس ہو رہا ہے وہ الوژن ہے۔ اصل تک پہنچنے کا طریقہ مراقبہ کے ذریعے باطنی حواس کی بیداری ہے۔ (عدنان نذیر۔ اٹک)

کرۂ زمین دراصل پردہ (اسکرین) ہے جس پر اطلاع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اطلاع موجودات کی حرکات وسکنات کا پروگرام ہے جو غیب سے نشر ہو رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے،

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اس نیلے گنبد کے پردہ میں ایک ہستیٔ مطلق ہے جو نظام حیات چلا رہی ہے۔ آسمان بھی اسکرین ہے اور زمین بھی۔ دونوں میں بلند واعلیٰ ہستی اللہ تعالیٰ کے حکم کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مظاہرہ کو اس مثال سے سمجھیں۔ پروجیکٹر سے روشنی فلم کی ریل سے فریم در فریم گزر کر سنیما اسکرین پر پڑتی ہے تو فلم میں کردار ہنستے، بولتے، چلتے، پھرتے اور آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ کردار اس روشنی کے دوش پر منتقل ہو رہے ہیں جو سورس سے آ کر اسکرین پر پھیلتی ہے اور رنگ رنگ خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔

سوال ہے کہ خدوخال کہاں سے آئے؟ کس نے زندگی کے مختلف کردار — بھوک، پیاس خورد ونوش، مامتا، جنس، ہمدردی، محبت اور نفرت کے تقاضوں کو تصویر دی —؟ کرداروں کی اصل فلم کی ریل میں ہے جو پروجیکٹر پر نصب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''زمین میں چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ وہ جہاں رہتا ہے، اللہ اسے بھی جانتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ سب کچھ کتاب مبین میں درج ہے۔'' (ہود:۶)

رنگ رنگ زمین ایسی اسکرین ہے جس پر تخلیقات کا عکس منعکس ہو رہا ہے۔ (نعیم قریشی۔ کراچی)

مراقبہ سے مراد ہے کہ ذہن کسی کام میں اس طرح مصروف ہو جائے کہ اس کے اوپر سے زمان ومکان کی گرفت ٹوٹ جائے۔ آپ کو تجربہ ہوگا کہ کوئی کتاب جو آپ کی دل چسپی کے مطابق ہے، پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گھڑی پر نظر پڑتی ہے تو حیران ہوتے ہیں کہ چار گھنٹے ہو گئے پتہ نہیں چلا۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے چار گھنٹے کتاب مسلسل پڑھی، اس دوران نشستیں بھی بدلیں۔ کبھی آلتی پالتی بیٹھ گئے، کبھی ٹانگیں سیدھی کر لیں، کبھی تکیہ لگا کے پڑھنے لگے، کبھی لیٹ گئے۔ اس دوران آپ نے پانی پیا، کوئی بندہ آیا، اس کی بات کا جواب بھی دیا لیکن آپ کو چار گھنٹے کا احساس نہیں ہوا — آخر کیوں؟

شوکت تھانوی

بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہوجائے

آم کے موسم کی مناسبت سے قارئین کے ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کے مایۂ ناز مصنف شوکت تھانوی مرحوم کی شگفتہ تحریر شائع کی جارہی ہے جو انہوں نے مرزا غالبؔ کے ایک شعر کو مرکزی خیال بنا کر لکھی۔

(موٹر کے آکر ٹھہرنے اور ہارن دینے کی آواز۔)

نزہت: آپا ــــ رخشاں آپا ــــ کار آئی ہے، شاید سہیل صاحب آگئے۔

رخشاں: تو میں کیا کروں تم جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دو اور ابا جان کو اطلاع کر دو۔

نزہت: ابا جان سے پہلے آپ ان سے مل لیجئے ورنہ سارا قصہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

رخشاں: خیر میں بھی مل لوں گی تم ان کو بٹھاؤ تو سہی۔

(پھر موٹر کا ہارن بجتا ہے)

نزہت: وہ خود ہی ہارن بجا بجا کر ابا کو خبر کر دیں گے۔ توبہ ہے نہ جانے سینڈل کیوں مسہری کے نیچے گھس گئی۔

رخشاں: میری سینڈل پہن لو مگر جا چکو کسی طرح۔

نزہت: جاتے ہی جاتے تو جاؤں گی۔

سہیل: ہیلو! نزہت بی بی ہیں، السلام علیکم۔

نزہت: وعلیکم السلام تشریف لائیے نا۔ آج تو واقعی معلوم ہوتا ہے آپ تصویر کھنچوانے آئے ہیں۔ خوب ہے یہ ٹائی اور رومال تو کیا کہنا۔ ٹھہریئے میں لہسن پیاز کے چھلکے اٹھا لاؤں نظر اتارنے کو۔

سہیل: خیر! اس صراحت سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کی آپا کہاں ہیں؟

نزہت: آپا؟ آپ کو آپا سے ملنا ہے۔ کارڈ ہے آپ کے پاس۔ میرا مطلب راشن کارڈ نہیں، وزیٹنگ کارڈ۔

سہیل: میں چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب قبلہ سے ملنے سے پہلے آپ کی آپا سے کچھ آخری ہدایات لے لوں۔

نزہت: اس سوٹ میں آپ کو گرمی نہیں لگ رہی ہے۔ کپڑا تو بہت شان دار ہے اور سلا ہوا بھی خوب ہے مگر آج میں نے کیلنڈر میں دیکھا تھا کہ ابھی تو صرف اگست ہے اور آپ کا سوٹ کہہ رہا ہے دسمبر ہے۔

سہیل: بات یہ ہے کہ مجھے آج مری جانا ہے۔

نزہت: اچھا تو سلک وغیرہ کے ٹھنڈے سوٹ وہاں کے لئے رکھے ہوں گے۔ ٹھیک ہے اب سمجھ گئی میں۔

سہیل: لاحول ولاقوۃ۔

نزہت: توبہ ہے اس طرح لاحول پڑھا آپ نے

کہ میں سمجھی آپا آ گئی ہیں۔ اچھا ٹھہریئے میں ان کو بھیج دیتی ہوں۔ بات یہ ہے سہیل بھائی وہ تو خود آنا چاہتی ہوں گی مگر ان کی سینڈل میں پہن آئی ہوں۔ اب میں جاؤں تو وہ آئیں۔

سہیل: کرم نوازش، مہربانی کسی طرح آپ کو خیال تو آیا ان کو بھیجنے کا۔

نزہت: پنکھا کھول دوں مگر توبہ مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ آپ تو یوں ہی گرم سوٹ پہنے ہیں۔ اچھا آپ یہ رسالہ پڑھیے میں جب تک ان کو بھیجوں۔

سہیل: (زیرلب) توبہ ہے کس قیامت کی گرمی ہے اور پنکھا بھی اس شریر نے نہ کھولا۔

(رخشاں داخل ہوئی)

سہیل: آداب بجالاتا ہوں۔

رخشاں: تسلیم، کیسی طبیعت ہے آپ کی۔

سہیل: اچھا تو ہوں، کیوں؟

رخشاں: نزہت کہہ رہی تھی کہ آپ گرم سوٹ پہنے ہیں اور پنکھا کھولنے کو منع کیا ہے۔

سہیل: (ہنس کر) شریر کہیں کی بڑی جھوٹی ہے۔

رخشاں: عجیب جھوٹ ہے جس کی سچائی میں خود دیکھ رہی ہوں۔ پنکھا بند ہے، سوٹ گرم ہے۔

سہیل: خیر چھوڑیئے اس قصہ کو۔ یہ بتایئے کہ مجھ کو شیخ صاحب قبلہ نے طلب کیا ہے تو کس قسم کی باتیں مجھ سے پوچھی جائیں گی۔ کیا جواب دینا چاہئے مجھے ان کے ہر سوال کا۔ کس قسم کی باتیں وہ ناپسند فرماتے ہیں۔ کس قسم کی باتیں پسند کرتے ہیں۔ کچھ راہ نمائی کیجئے۔

رخشاں: آپ چاہتے ہیں کہ میں پرچہ آؤٹ کردوں؟ یہ ایمان داری کی بات نہیں۔ خیر میں اتنا بتائے دیتی ہوں کہ آم منگائے گئے ہیں آپ کے لئے طرح طرح کے۔

سہیل: آم؟ یہ کون پوچھ رہا ہے آپ سے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ مجھ سے باتیں کس قسم کی ہوں گی۔

رخشاں: زیادہ تر آموں کے متعلق۔

سہیل: رخشاں میں بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں اس لئے کہ مجھے شیخ صاحب قبلہ کے معیار انتخاب کا اندازہ نہیں ہے۔ دو چار موٹی موٹی باتیں تو ظاہر ہیں کہ خاندانی حالات دریافت کریں گے۔

رخشاں: جی نہیں۔ اس کے متعلق وہ تحقیقات کر چکے ہیں۔ یہ باتیں شخصِ متعلق سے نہیں غیر متعلق لوگوں سے پوچھی جاتی ہیں۔

سہیل: مثلاً تعلیمی حالت پوچھ سکتے ہیں کہ کس سنہ میں گریجویٹ ہوئے۔

رخشاں: معاف کیجئے گا دامادی نہ کوئی عہدہ ہے نہ میں کوئی ملازمت ہوں جس کے لئے درخواست کے ساتھ سرٹیفکیٹس کی نقل لگانا ضروری ہو۔

سہیل: پھر آخر کس قسم کی باتوں کی امید ہے۔

رخشاں: بتایا تو ہے آموں کے متعلق باتیں ہوں گی۔

سہیل: پھر وہی آم! آخر یہ کیا مذاق ہے؟

رخشاں: یہ مذاق نہیں بلکہ بے حد سنجیدہ بات ہے۔ اب اس کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں کہ آپ اس کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ دیکھئے جہاں تک خاندانی حالات اور ذاتی شرافت کا سوال ہے اس کے متعلق ابا جان پوری تحقیقات کر کے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ آپ کو ملنے کی یہ زحمت دی گئی ہے۔ اگر اس طرف سے مطمئن نہ ہوتے تو یہ سوال پیدا نہ ہوتا۔

سہیل: اچھا یعنی اس طرف سے مطمئن ہیں۔

رخشاں: جی ہاں۔ رہ گئی تعلیمی حالت وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ وکالت مڈل پاس کر کے نہیں کی جاتی۔ سب لے دے کر ان کو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کس حد تک مہذب، کتنے صاف گو، کس حد تک ایمان دار ہیں اور عام بات چیت اور نشست و برخاست میں آپ کا معیار زندگی کیا ہے۔ بس اسی کے لئے آم منگائے گئے ہیں۔

سہیل: یہ بات وہ بات اور پھر آم! یہ آموں کی آخر کیا تُک ہے؟

رخشاں: آموں کی یہ تُک ہے کہ ابا جان آم کھلا کر یہ اندازہ کیا کرتے ہیں کہ کھانے والا کس کلاس کا شخص ہے۔ اس میں سلیقہ کی مقدار کیا ہے۔ وہ کس حد تک خوش مذاق ہے۔ اس کے ذوقِ سلیم کا معیار کیا ہے۔ وہ کتنا مہذب ہے اور بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ ان کا داماد بن سکے۔

سہیل: یعنی واقعی؟ کیا سچ مچ وہ آموں کے سلسلہ میں اس قدر سنجیدہ ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

رخشاں: یہ تو آپ جانیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے۔ بہر حال ابا جان کا خیال ہے کہ اچھے قسم کے آم دیکھ کر عام سطحی آدمی مشکل سے لئے دیئے رہ سکتا ہے۔

سہیل: خیر اس طرف سے تو آپ اطمینان رکھئے میں آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھوں گا آموں کی طرف۔

رخشاں: ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ وہ سمجھیں گے کہ بینائی میں کوئی خرابی ہے اور اگر یہ یقین ہو گیا کہ آپ دیکھ بھال کر آموں سے بے رخی اور بے اعتنائی برت رہے ہیں تو وہ آپ کو بدذوق سمجھ کر نامنظور کر دیں گے۔

سہیل: پھر؟ گویا مجھ کو میانہ روی سے کام لینا چاہئے کہ نہ اس طرح آموں پر ٹوٹ پڑوں گویا کبھی دیکھے نہ تھے، نہ ایسی بے رخی برتوں کہ گویا اب نہیں دیکھ رہا ہوں۔

رخشاں: جی ہاں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کی عام معلومات کا امتحان آموں کے سلسلہ میں لیا جائے گا کہ بتائیے یہ کون سا آم ہے اور بتائیے اس آم کا کیا نام ہے اور کس خاندان سے تعلق ہے۔

سہیل: بھئی یہ تو بڑی مشکل بات ہے میرے تو فرشتوں کو بھی آموں کے متعلق خبر نہیں۔

رخشاں: میں آپ کو بتائے دیتی ہوں ایک دبلا پتلا لمبا سا آم ہے اس کا نام دسہری، ملیح آباد اس کا ددھیال اور سندیلہ ننھیال ہے۔ بھینی بھینی خوش بو، بے ریشہ قلمی آم ہے اور ثمرِ بہشت کے بعد سب آموں سے افضل ہے۔

سہیل: یہ گویا ایک قسم ہوئی۔ تو بہ ہے صاحب اور

بھلا کتنی قسم کے ہوں گے آم۔

رخشاں: سنتے جایئے۔ دوسرا آم ہے سبز رنگ کا نہ لمبا نہ پستہ قد، گولائی لئے ہوئے۔ اس کا نام ہے لنگڑا۔ بنارس اس کا وطن ہے مگر اب پاکستان میں بھی ہجرت کر کے آ گیا ہے۔ بے حد شیریں اور غذائیت کے اعتبار سے ذرا وزنی ہے۔

سہیل: بنارس وطن۔ نام لنگڑا۔ مزہ شیریں! یہ چوسا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے؟

رخشاں: قلمی آم ہے یہ بھی۔ اور تخمی آموں میں ایک نازک سے چھلکے کا سنہری رنگ کی زردی لئے ہوئے آم ہے۔ اس کو انگبین بھی کہتے ہیں اور جام جم بھی۔ پتلا رس، نازک چھلکا، چھوٹی گٹھلی — چوسا جاتا ہے۔

(شیخ صاحب کی آواز آتی ہے)

شیخ صاحب: میاں شکور! آم کا پانی بدل دو۔

رخشاں: میں چلی ابا جان آ رہے ہیں اسی طرف۔

سہیل: اور کون کون سے آم ہیں۔

رخشاں: دو چار قسمیں اور ہیں۔ احتیاط سے کھایئے گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

سہیل: مگر سنو، سنو تو! چلی گئیں۔ پہلا آم تھا دسہری، وطن بنارس۔ بھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں۔ لنگڑے کے بعد ملیح آباد۔

شیخ صاحب: السلام علیکم تشریف رکھئے۔ آپ کا اسم مبارک سہیل ہے۔ یہ تو ستارہ ہوا کرتا ہے بہر حال،

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

سہیل: خوب فرمایا آپ نے۔

شیخ صاحب: یہ میں نے نہیں فرمایا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا فرمودہ ہے۔ بھئی اندر چلو یہاں محفل نہیں جم سکتی۔ یہ ڈرائنگ روم کی چیزیں ہمارے مزاج سے اس قدر مختلف ہیں کہ اب مثلاً آم ہی نہیں کھا سکتے یہاں۔

سہیل: بجا ارشاد ہوا۔ لیڈی کرزن نے بھی آموں کے متعلق یہی لکھا ہے کہ دنیا کا بہترین پھل ہے مگر غسل خانہ میں کھانا چاہئے۔

شیخ صاحب: یہ کیا بات ہوئی۔ یہ مہمل حوالہ دیا ہے آپ نے۔ لیڈی کرزن بھلا آموں کو کیا سمجھ سکتی تھیں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہوئی کہ آپ مجھ سے کہیں کہ مرزا غالبؔ نے چاکلیٹ کے متعلق نظم کہی ہے بہر حال تشریف لایئے۔

(دونوں جاتے ہیں، پس پردہ دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ)

نزہت: بے چارے سخت پریشان ہیں۔

رخشاں: چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

نزہت: اس طرح ساتھ ساتھ جا رہے ہیں جیسے سچ مچ کچہری میں جائے کوئی۔

(شیخ صاحب باتیں کرتے ہوئے قریب آتے ہیں)

شیخ صاحب: کہہ دیا آپ نے لیڈی کرزن نے یہ کہا ہے۔ بہر حال تشریف رکھئے کیا خیال ہے آپ کا کس آم سے ابتدا کرنی چاہئے۔

سہیل: جی میرا تو خیال ہے کہ آموں کے سلسلہ میں ابتدا انتہا کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ صاحب: جی ہاں بعض اہلِ ذوق یہ بھی کہتے ہیں مگر باقاعدگی اسی میں ہے کہ پہلے قلمی آم کھائے جائیں تاکہ معدہ کو کام کرنے کا موقع ملے۔ تخمی آم تو خود تحلیل شدہ ہوتے ہیں۔ معدہ ان کو سر آنکھوں پر بھی جگہ دے سکتا ہے مگر قلمی آموں میں آپ مقدم اور موخر کی ترتیب کیا رکھتے ہیں ــــ؟

سہیل: مشاعرہ والی ترتیب کہ اساتذہ بعد میں۔

شیخ صاحب: خوب کہا آپ نے خوب۔ اچھا آپ ہی کاٹئے۔ یہ لیجئے چھری، یہ رہی طشتری اور مختلف کانسوں میں مختلف آم ہیں۔ بسم اللہ ــــ پہلے آپ پری وش کاٹئے۔

سہیل: جی؟ ــــ پری ــــ کون؟

شیخ صاحب: صاحب پری وش کہہ رہا تھا میں۔ وہ ہے تیسرے کانسے میں۔

سہیل: اچھا اچھا پری وش خوب ہوتا ہے یہ بھی۔

شیخ صاحب: ایں یہ کیا؟ یہ کون سا نکال لیا آپ نے کون سا آم ہے۔

سہیل: جی پری وش فرمایا تھا آپ نے۔

شیخ صاحب: کیا خوب گویا میں نے کہا تھا۔ یہ پری وش ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دسہری اور پری وش دونوں نہیں جانتے۔

سہیل: جی نہیں! دسہری جانتا ہوں۔ دبلا پتلا لمبا سا آم۔ نام دسہری، وطن بنارس۔

شیخ صاحب: ایں؟ وطن بنارس؟ میاں دسہری کا وطن بتا رہے ہو، ناواقفیت کی بھی حد ہے۔ استغفراللہ! چھوڑو اسے میں کاٹتا ہوں۔ بھئی یہ تو انتہا ہے بے خبری کی۔ لیجئے نوش فرمایئے۔

سہیل: سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔

شیخ صاحب: خوب ہوتا ہے یہ آم بھی (کھا کر) آخ تھو ــــ یعنی آپ نے اس کی تعریف کی تھی۔ یہ چوٹ کھایا ہوا آم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہیں گرا ہے اور شیرینی کے ریشے زخمی ہوکر منتشر ہوگئے ہیں۔ ذائقہ میں وہ ربط اور تنظیم باقی نہیں جو دسہری کی روح ہے۔ آپ کے بس کی یہ چیز نہیں۔ آپ تخمی کھائیں یہ لیجئے۔

سہیل: شکریہ۔

شیخ صاحب: اس کو پہلے نرم اور سبک گرفت سے گھلایئے۔ لاحول ولاقوۃ ــــ میاں! یہ کیا کر رہے ہو۔ سارا سوٹ خراب کرلیا۔ رس چھلکا پھاڑ کر نیچے سے نکل گیا۔ تشریف لے جایئے وہ ہے سامنے غسل خانہ۔ توبہ! آم کھانے کا بھی سلیقہ نہیں۔ آپ کے لئے سچ کہا تھا لیڈی کرزن نے کہ غسل خانہ میں آم کھایا کیجئے۔ وہ ہے غسل خانہ!

سہیل: میں ابھی حاضر ہوا۔

شیخ صاحب: میاں شکور! یہ صاحب غسل خانہ سے باہر آئیں تو کہہ دینا کہ میں باہر جارہا ہوں۔ ایسے لوگ میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ آم کھانے کا سلیقہ نہیں، چلے ہیں شادی کرنے میری لڑکی سے۔ توبہ!

عائشہ خان

مرشد کی باتیں

پھر اہرام کے دور کے فراعین دیکھے، سر پر مخصوص تاج تھے، آنکھوں میں غضب اور وحشت تھی۔ تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔ نظر آگے پیچھے گئی تو فوارہ دکھائی دیا۔ اس کے بعد سر پر پگڑی پہنے کوئی شخص مخصوص ترکی لباس میں صوفیوں کا رقص کر رہا تھا۔

خانقاہ میں ہمیشہ کی طرح سکون اور سکون نے سکوت کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ کلاک وائز موومنٹ مغلوب ہو کر اینٹی کلاک وائز موومنٹ غالب تھی۔ جوتے اتار کر جیسے ہی وہ مڑا، نظر خانقاہ میں داخل ہونے والی ہستی پر پڑی اور وہ بے خبر ہو گیا۔ اب تک تصویر دیکھی تھی — پہلی مرتبہ تصویر سے باہر ایک اور تصویر میں دیکھا۔ مخصوص وضع قطع، سادہ لباس، شانِ بے نیازی اور جلال میں جمال — ان کا رخ سفید جالیوں والے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اس کے مرشد سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ انہیں اندر جاتے دیکھا اور پھر نظر کے سامنے پردہ آ گیا۔

ٹائم اسپیس، غیب ظاہر، شعور لاشعور، زندگی موت، وقت کا گزرنا اور گزرنے کے باوجود موجود رہنا کیا ہے —؟ جس دور میں ناگپور کی زمین اور لوگوں نے اس مقرب بارگاہ ہستی کو ظاہری روپ میں دیکھا — وہ دور گزر چکا ہے، اس دور میں بسنے والے لوگ اب اِس عالم میں نہیں لیکن بزرگ یہاں وہاں موجود ہیں۔

دوسری ملاقات شعور کے اس پار لاشعور میں ہوئی۔ پہلے خانقاہ نظر آئی اور پھر میدان منظر بنا۔ بزرگ کو چلتے ہوئے دیکھا۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ آگے نکل گئے اور میدان کے اس حصہ کی جانب پہنچے جہاں میز رکھی ہوئی تھی اور کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

وہ ادب و احترام کے ساتھ چلتے ہوئے میز تک پہنچا جہاں تقسیم کے لئے کارڈز رکھے ہوئے تھے اور لوگوں کو کسی خاص مناسبت سے رنگ دیئے جا رہے تھے۔

بزرگ نے اس کی طرف اشارہ کر کے وہاں موجود لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو سیاہ رنگ دو۔

سب حیران ہو گئے کیوں کہ سیاہ رنگ ابھی تک کسی کو نہیں ملا تھا۔ دوبارہ حکم ہوا — صرف سیاہ نہیں، جتنے رنگ ہیں اس کو سب رنگوں کے کارڈز دے دو۔ ہر ایک دم بخود اور متحیر تھا۔

لوگوں میں سے ایک نے کہا، ''دینے والے'' جب کسی کو دیتے ہیں تو ایسے بھی دیتے ہیں۔

شیخ طریقت سے خواب کی تعبیر پوچھی۔

فرمایا، خواب کا تعلق وقت سے اور وقت کا تعلق منکشف ہونے سے ہے۔ انسیت کے سبب ملاقات ہوئی۔ کسی کو یاد کرنے سے ربط قائم ہوجاتا ہے پھر اوصاف منتقل ہوتے ہیں۔ ہر وقت ذکر وفکر میں رہو تاکہ ذہن یک رنگ ہوجائے۔

شیخ طریقت مہمانوں سے مخاطب تھے، وہ قریب بیٹھا ہوا تھا اور نظر قالین پر تھی۔ وہ اکثر فرماتے ہیں کہ قالین کو غور سے دیکھو، بے شمار شکلیں نظر آئیں گی۔ بعض اوقات وہ خود قالین کی طرف اشارہ کرکے فرماتے کہ دیکھو یہ شیر ہے، یہ آدمی ہے وغیرہ۔ اسی طرح تخت پر بچھی چادر کی طرف متوجہ کرکے بتاتے کہ انہیں اس میں کون سی اشکال نظر آرہی ہیں۔ مرید دیکھنے کی اس طرز سے ناواقف تھا اور سوچتا کہ ان چیزوں پر اشکال نظر آنا کیا ہے۔

ایک روز انہوں نے چادر کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھو! یہ پھول ہیں۔ نظر آئے؟

وہاں صرف لکیریں تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

فرمایا، آپ کو مشق نہیں ہے۔

اب اس نے ان باتوں پر توجہ دینا شروع کی۔ جس شے پر لکیریں ہوتیں، غور سے دیکھتا۔ ذہن سوالات کے بھنور میں پھنس جاتا اور مشق رہ جاتی۔

ایک روز نظر قالین پر گئی اور ٹھہر گئی — اس نے دیکھا کہ قالین سانس لے رہا ہے۔ آہستہ سے اوپر اٹھتا پھر نیچے بیٹھ جاتا۔ آنکھوں کا دھوکا گمان ہوا۔ دائیں حصہ پر نظر دوڑائی تو وہاں بھی یہی عالم تھا۔ درمیان میں دیکھا— منظر وہی تھا۔

سوچا کہ شاید میں اپنے سانس لینے کو قالین کا سانس لینا گمان کررہا ہوں۔ سانس روک دی لیکن قالین میں نظام تنفس جاری تھا۔ مدھم رفتار سے پھولتے ہوئے اوپر کی جانب اٹھتا اور رفتار کی یکساں مقدار کے تحت بیٹھ جاتا۔ نمایاں بات یہ تھی کہ قالین کے سانس لینے اور سانس خارج کرنے کا دورانیہ ایک تھا۔

مرشد کریم سے عرض کیا کہ حضور! آج میں نے قالین کو سانس لیتے دیکھا۔

فرمایا، آپ نے دیکھا نہیں، آپ کو دکھایا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب چاہا دیکھ لیا۔ دکھانے سے سکت بڑھانا مقصود ہے۔

شعور پر ضرب پڑی تھی کیوں کہ اس نے کبھی قالین کو اپنی طرح مخلوق نہیں سمجھا۔

عرض کیا، آدمی اپنے علاوہ کسی کو مخلوق اور ذی شعور نہیں سمجھتا اس لئے ذہن حیرت میں ہے۔

فرمایا، ہر موجود شے زندہ ہے اور سانس لیتی ہے۔ موجود ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس میں زندگی ہے۔ زندگی نہ ہو تو وہ موجود نہیں ہوگی۔ توجہ جس شے

پر مرکوز ہو جائے، تصویر میں حرکت نظر آتی ہے۔ قالین کو غور سے دیکھیں، اس میں آپ کو بے شمار شکلیں نظر آئیں گی۔

صاحبِ طریقت کی کسی بات کو وہ سرسری طور پر نہیں لیتا، ہر لفظ میں تعلیم اور ہر لفظ میں تربیت ہے۔ جو بات نظر انداز ہو جائے، کسی نہ کسی صورت میں پلٹ کر آتی ہے۔ پہلے تجربہ کے بعد اکثر غور کرنے پر قالین کو سانس لیتے ہوئے دیکھا۔

ایک روز ملاقات کے لئے گیا تو وہ مصروف تھے۔ لہٰذا انتظار کیا اور وقت گزارنے کے لئے نظر ماربل کے فرش پر جما دی۔ نگاہ ٹھہرتے ہی سورج کی شبیہ بنی۔ چند لمحوں بعد بلی کا چہرہ نظر آیا۔ پھر اہرام کے دور کے فراعین دیکھے، سر پر مخصوص تاج تھے، آنکھوں میں غضب اور وحشت تھی۔ تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔

نظر آگے پیچھے گئی تو فوارہ دکھائی دیا۔ اس کے بعد سر پر پگڑی پہنے کوئی شخص مخصوص ترکی لباس میں صوفیوں کا رقص کر رہا تھا۔ منظر میں ڈوب جانے سے محسوس ہوا کہ وہ نہیں، میں جھوم رہا ہوں۔

پتھر پر نقش و نگار ایک کے بعد ایک واضح ہو رہے تھے۔ دیکھا کہ کوئی شخص ہاتھ اوپر کئے چھوٹے درخت پر سے پھل توڑ رہا ہے۔ پھر ٹوپی پہنے ہوئے ایک چہرہ نظر آیا جو سہما ہوا تھا۔ بعد ازاں کئی چہرے دیکھے جن پر بے بسی تھی جیسے نوحہ کناں ہوں۔

ماربل پر کندہ لکیروں میں اس نے ہاتھ فضا میں لہراتا ہوا اور دایاں پیر اٹھائے درباری لباس میں ایک شخص دیکھا جیسے کرتب پیش کر رہا ہو۔ پھر دوشیزہ کی تصویر نظر آئی۔ چند لمحوں بعد وہ پیر پیچھے کئے ہوئے بیٹھی دکھائی دی مگر اب وہ چھوٹی بچی تھی۔ معلوم ہوا کہ سر جھکائے نماز پڑھ رہی ہے اور قعدہ کی حالت میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پودے سے ہم کلام نظر آئی۔ ذہن پر دباؤ بڑھا اور اس نے فرش پر سے نظر ہٹالی۔

پتھر پر اتنے مناظر دیکھ کر کشمکش و پنج میں پڑ گیا کہ آیا لکیروں میں اتنی تصویریں ہیں یا میں نے ذہن کا تغیر دیکھا ہے؟

اس دوران شیخ طریقت نے آواز دی۔

مشاہدہ بیان کر کے پوچھا کہ میں نے کیا دیکھا؟

انہوں نے فرمایا کہ آپ نے تغیر دیکھا اور تغیر میں حال، مستقبل اور ماضی نے دور کر لیا۔ جو کچھ آپ نے دیکھا اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس میں ذہن پر زور پڑے۔ یہ نظر کے لئے ایک قاعدہ ہے۔ پہلے اس طرف متوجہ کیا گیا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔ ایک حرکت نظر آتی ہے اور ایک حرکت نظر نہیں آتی۔ نظر نہ آنے والی حرکت لاشعوری ایکٹیویٹی ہے۔ پہلے آپ کو دکھایا گیا کہ یہ سب شکلیں ہیں اور ساری شکلیں الوژن ہیں۔ کیا آپ اس کو اصل کہیں گے —؟ اصل نہ سمجھیں تو اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور آئے گا کہ الوژن

کیا ہے اور اصل کیا ہے۔

شے ایک ہے الوژن کی وجہ سے ہر شے الگ نظر آ رہی ہے۔ الوژن کے معنی ہیں کہ ایک چیز ہے پر نہیں ہے۔ میں ہوں، میں نہیں ہوں۔ میں یہاں ہوں، دفتر میں نہیں ہوں۔ میرا ہونا اور نہ ہونا دراصل نہ ہونا ہے۔ ہم واقف نہیں ہیں اس چیز سے۔ ہم تصویریں ہیں اور تصویریں الوژن ہیں۔

پتھر کی لکیروں میں زندگی کے سارے ادوار موجود ہیں۔ ایک دور غائب ہوتا ہے اور دوسرا حاضر ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن پتھر کو غور سے دیکھیں تو غیب ظاہر غیب کی حقیقت سوالیہ نشان ہے۔

غیب ظاہر غیب کا ایک نام وقت ہے اور وقت میں ماضی، حال اور مستقبل کا یکجائی پروگرام ریکارڈ ہے۔

مرشد کریم کے ملفوظات ''مرشد کی باتیں'' کا بیان مرید کے لئے اعزاز ہے۔ تحریر کا مقصد ذہن کو تفکر کے پیٹرن پر قائم کر کے سوچ الوژن سے پاک کرنا ہے تاکہ لکھنے والے اور پڑھنے والوں کا دل مجلّا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم اور رحمت و شفقت سے، ایک صاحبِ علم بندہ کی راہ نمائی میں مرید کو الوژن سے نکلنے کا راستہ دکھایا اور مشاہدہ بھی کروایا۔ تفکر جب مشاہدہ میں داخل ہوتا ہے پھر.....اجازت نہیں ہے۔

لہر اور سمندر ــــ؟

کبھی آپ نے سمندر میں سے اٹھتی ہوئی موجوں کو دیکھا ہے ــــ؟ یہ موجیں سمندر میں سے ٹھیک ساحل پر جبیں ریز ہوتی ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ موجوں اور لہروں کی بے قراری، بے تابی، تڑپ اور کروٹ کروٹ طغیانی کا راز کیا ہے ــــ؟

موج جب اپنی اصل سمندر سے دور ہوتی ہے تو اس کے اوپر دوری کا احساس غالب آ جاتا ہے، وہ بار بار ساحل سے سر ٹکراتی ہے۔ اسے فراق کی گھڑیاں قیامت لگتی ہیں۔ سمندر اپنا ایک تشخص رکھتا ہے۔ جوش، جلال اور عظمت سے جب وہ اپنی حیثیت کا مظاہرہ کرتا ہے تو آسمانوں کے کناروں کو چھوتی ہوئی لہریں اس کے باطن سے باہر آ جاتی ہیں اور ساحل پر اپنی پیشانی رکھ دیتی ہیں۔ عظمت و جرأت کا مظاہرہ انہیں اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ فرش پر سجدہ میں گر جائیں۔ لہریں جیسے ہی فرش پر جبین نیاز رکھتی ہیں، سمندر انہیں اپنی آغوش میں ایسے سمیٹ لیتا ہے کہ لہر اور سمندر ایک ہو جاتے ہیں۔ سمندر میں مدوجزر، جوار بھاٹا، لہروں کا تلاطم سمندر کے تشخص میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل بن جاتا ہے۔ (صدائے جرس)

اقتباسات

''ماہنامہ قلندر شعور'' کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

کائنات کیا ہے، کیوں ہے اور کائنات کیسے شروع ہوئی؟ جیسے جیسے انسانی سوچ میں ارتقا ہوتا رہا، یہ سوالات اہمیت اختیار کرتے گئے۔ ارتقائی عمل سے گزرنے والے شعور نے ــــ زمین کی پستی میں جب اپنے اوپر آسمان کو چھت دیکھا تو اسے چاند، سورج، ستارے نظر آئے۔ چاند سورج ستاروں کا گھٹنا، بڑھنا، ڈوبنا طلوع ہونا شعور کے لئے مزید سوالیہ نشان بن گیا۔ آدم زاد نے سوچنا شروع کر دیا کہ گھٹنے، بڑھنے، پیدا ہونے، نشوونما پانے اور فنا ہونے کا نام کائنات ہے۔ اس نے یہ راز جان لیا کہ کائنات مسلسل حرکت ہے۔ ایسی حرکت جو ہر آن ظاہر ہوتی ہے اور دوسری آن آنے سے پہلے مخفی ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: محمد فاران۔ بہاولپور، کتاب: اسم اعظم)

علم حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ میں صرف دولت کماؤں، لوگ میری عزت کریں، میں لوگوں میں ممتاز ہو جاؤں۔ علم حاصل کرنے سے یہ سب تو خود بہ خود حاصل ہو جاتا ہے۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس لئے علم حاصل کر رہے ہیں تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کے کاموں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ آپ کو یہ بات زیادہ اچھی طرح سے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور ہم مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اور اس پوری دنیا کے مالک ہیں۔ وہ کیسے تخلیق کرتے ہیں۔ کیسے اپنی مخلوق کی پرورش کرتے ہیں، اپنی مخلوق کو وسائل فراہم کرنے کا کیسا انتظام بنایا ہوا ہے اور جو انتظام بنائے گئے ہیں ان کی دیکھ بھال کیسے کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں قرآن میں درج ہیں۔ اس لئے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ عربی زبان کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی یاد کریں۔ (مرسلہ: بی بی رفاقت۔ کوئٹہ، کتاب: ہمارے بچے سیریز۔ ا)

تربیت کے دو طریقے ہیں۔ ایک غیر اختیاری اور دوسرا اختیاری۔ غیر اختیاری طریقہ یہ ہے کہ بچہ جو کچھ گھر کی چار دیواری اور ماحول میں دیکھتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اختیاری صورت یہ ہے کہ والدین اسے مخصوص تربیت کے ساتھ معاشرہ سے روشناس کراتے ہیں اور جب یہ بالغ فرد ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی ایک شخصیت بن جاتی ہے۔ (مرسلہ: سنان بخاری۔ کراچی، کتاب: بیراسائیکالوجی)

جن پودوں کے بیج پانی کے ذریعے پھیلتے ہیں، ان بیجوں کی خصوصیات دوسرے بیجوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر پانی کے ذریعے اپنے بیجوں کو پھیلانے والے پووں کے بیجوں کا پھیلاؤ زیادہ اور وزن کم ہوتا ہے۔ وہ ٹشوز جو انہیں تیرنے میں مدد دیتے ہیں، مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں، ان کے خلیے اسفنج نما بھی ہو سکتے ہیں جن کے خالی حصوں میں ہوا بھر جاتی ہے اور پھر وہ آسانی سے تیر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان بیجوں کے اندر اضافی احتیاطی حصہ ہوتا ہے جو ایمبریو کی حفاظت کرتا ہے۔ ایمبریو کے اندر پودے کی جینیٹک معلومات موجود ہوتی ہیں۔ پانی کے ذریعے پھیلنے والے بیجوں کے علاوہ ایسے بیج ہیں جو تقریباً 80 دن تک پانی میں رہتے ہیں۔ اس دوران نہ خراب ہوتے ہیں نہ پھوٹتے ہیں کیوں کہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ایسے بیجوں میں سب سے مشہور ناریل کے بیج ہیں۔ (مرسلہ: کاشف۔ کراچی، کتاب: یہ پُر شکوہ کائنات)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انا، تفکر اور شخص ہیں کیا؟ یہ وہ ہستیاں ہیں جو لاشمار کیفیات کی شکلوں اور سراپا سے بنی ہیں مثلاً بصارت، سماعت، تکلم، محبت، رحم، ایثار، رفتار، پرواز وغیرہ۔ ان میں ہر ایک کیفیت شکل اور سراپا رکھتی ہے۔ قدرت نے ایسے بے حساب سراپا لے کر ایک جگہ اس طرح جمع کر دیئے ہیں کہ الگ الگ پرت ہونے کے باوجود ایک جان ہو گئے ہیں۔ ایک انسان کے ہزاروں جسم ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنات اور فرشتوں کی بھی یہی ساخت ہے۔ یہ تینوں ساخت اس لئے مخصوص ہیں کہ ان میں کیفیات کے پرت دوسری انواع سے زیادہ ہیں۔ کائنات کی ساخت میں ایک پرت بھی ہے اور کثیر تعداد پرت بھی ہیں۔ تاہم ہر نوع کے افراد میں مساوی پرت ہیں۔ (مرسلہ: محمد بلال۔ کراچی، کتاب احسان وتصوف)

کسی سے توقع نہ رکھی جائے اس لئے کہ جو بندہ کسی سے توقع نہیں رکھتا وہ ناامید بھی نہیں ہوتا۔ امیدیں توازن کے ساتھ کم سے کم رکھنی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جو آسانی کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔ (مرسلہ: شہناز، کتاب: کشکول)

گلِ نسرین

لکیروں میں مفہوم

جن اشیا کے ہم نے نام رکھ دیئے ہیں، کیا وہ بھی خود کو ان ناموں سے جانتی ہیں یا ان کے نزدیک اپنی پہچان اور ہے ــــ؟ کیا بکری کو معلوم ہے کہ لوگ اسے بکری کہتے ہیں ــــ؟ پھر بکری بولنے پر وہ ہماری طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتی ــــ؟ اگر متوجہ ہوتی ہے تو اس کی وجہ آواز ہے، اسے بکری پکارنا نہیں۔

زبان مفہوم بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک مفہوم کی رسائی میں آواز اور الفاظ کا کردار اہم ہے۔ دنیا میں بسنے والے تمام جان دار جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور سب کی اپنی زبان ہے۔کوئی بول کر محسوسات ظاہر کرتا ہے اور کوئی خاموش رہ کر۔دونوں حالتوں میں مفہوم لہروں کے ذریعے منتقل ہوتا ہے۔

الفاظ کی ساخت پر غور کیا جائے تو یہ مفہوم کی ایک شکل ہے جیسے زمین ــــ گھر اور اسکول و کالج میں بچوں کو زمین کے خدوخال اور خصوصیات کے بارے میں بتایا جاتا ہے جس سے ان کے ذہن میں تصویر بنتی ہے۔ اس کے بعد زمین کا لفظ جب ان کی سماعت سے ٹکراتا ہے تو حافظہ میں تصویر اپنی متفرق خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔زمین کی خصوصیات لفظ زمین میں موجود ہیں۔اس لفظ کو جس زبان میں بولا جائے، ذہن میں ابتدائی تصویر سپاٹ میدان کی بنتی ہے۔

لفظ کیا ہے ــــ؟ حروف کا مجموعہ ہے اور ہر حرف لکیر ہے۔لکیروں کی سمتیں، اوپر نیچے، دائیں بائیں، آڑی ترچھی ہوتی ہیں تو حروف بنتے ہیں۔سارے حروف کی بنیاد لکیریں ہیں لیکن سمتیں مختلف ہونے کی وجہ سے ان کو الف ب پ ت ٹ ث ج چ وغیرہ کا نام دیا گیا ہے۔ایک لکیر کا مختلف سمتوں میں ہونا، حروف کی شناخت ہے۔

لکیروں میں مفہوم کا مخفی ہونا کیا ہے ــــ؟ لکیریں ایک ہیں ــــ سمتیں الگ الگ نظر آتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ مفہوم لکیروں میں چھپا ہوا ہے یا ذہن نے لکیروں کی ساخت کو جس طرح سے حافظہ میں محفوظ رکھا ہے، اس کے مطابق تاثر پیدا ہوتا ہے ــــ؟

تصور کا عمل کسی بھی چیز کو ذہن کی اسکرین پر ظاہر کرتا ہے اور زبان لفظوں کے ذریعے تصویروں کو ایک دوسرے تک پہنچاتی ہے۔الفاظ بذات خود معنی نہیں

رکھتے، ان کو جو مفہوم دے دیا گیا ہے، اس کی تصویر ذہن میں بنتی ہے۔ فرد ماحول کے تحت دیئے گئے مفہوم کے مطابق چیزوں کو دیکھتا، سنتا اور بولتا ہے۔

سورج طلوع ہونے کے بعد کے وقت کو اردو میں دن، عربی میں نہار اور انگریزی میں day کہتے ہیں۔ عربی اور انگریزی سے ناواقف کے ذہن میں نہار اور ڈے سن کر تصویر نہیں بنتی، ذہن خالی ہوتا ہے۔ اب دن کہیں تو خالی اسکرین پر سورج نکلنے کے بعد کا وقت منعکس ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا—؟ ہم چیزوں کے بجائے مخصوص الفاظ سے واقف ہیں اور اس کے مطابق چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

الفاظ علامات ہیں جن کو اشکال کی پہچان کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ بات الفاظ تک اس لئے پہنچی کہ آدمی کی قوت تخیل کم زور ہے۔ لہروں پر اس کی دسترس نہیں، وہ کائناتی زبان سے ناواقف ہے اس لئے مختلف تہذیبوں میں زبانیں وضع کی گئیں۔ جس کو لفظ کہا جاتا ہے، اس کو لفظ نام ہم نے دیا ہے۔ لفظ کے بھی ہر زبان میں مختلف نام ہیں۔ انگریزی میں word اور ہندی میں شبد کہتے ہیں۔

جن اشیا کے ہم نے نام رکھ دیئے ہیں، کیا وہ بھی خود کو ان ناموں سے جانتی ہیں یا ان کے نزدیک اپنی پہچان اور ہے—؟ کیا بکری کو معلوم ہے کہ لوگ اسے بکری کہتے ہیں—؟ پھر بکری بولنے پر وہ ہماری طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتی—؟ اگر متوجہ ہوتی ہے تو اس کی وجہ آواز ہے، اسے بکری پکارنا نہیں۔

مخصوص صوتی ارتعاش کو ہم اس وقت سمجھتے ہیں جب ہمیں ان سے منسلک اشکال کا علم ہو۔ اجنبی الفاظ کے مفہوم سے لاعلمی کی وجہ سے ہم اس لفظ سے منسلک اشکال سے لاعلم ہوتے ہیں۔

ناموں کے معنی اخذ کر کے معنی کی بنا پر نام رکھا جاتا ہے۔ یعنی بچہ کا نام رکھنا ہو تو اس کی شناخت اردگرد موجود چیزوں اور پہچان سے جوڑی جاتی ہے۔ کسی کا نام سحاب ہے تو سحاب بادل کو کہتے ہیں۔ ہم نے فرد کی پہچان بادل سے منسوب کردی، فرد خود کون ہے، ہم اس سے لاعلم ہیں۔

ایک غیر منافع بخش بین الاقوامی ادارہ ''ایتھنولاگ'' کے مطابق دنیا میں اس وقت تقریباً سات ہزار ایک سو گیارہ (7111) زبانیں بولی جاتی ہیں۔

گلے میں موجود صوتی تاروں کی مدد سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے جو محققین کے مطابق 1100 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ ہم اسے آواز کا نام دیتے ہیں۔ آدمی کی آواز کی فریکوئنسی 20 ہرٹز سے لے کر 20 ہزار ہرٹز تک بتائی جاتی ہے۔ اس فریکوئنسی سے باہر اپنی آواز پیدا کرنے کی سکت آدمی میں نہیں، نہ اسے اس فریکوئنسی سے باہر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کائنات میں ہر طرف لہریں بکھری ہوئی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر طرف آوازیں پھیلی ہوئی

ہیں۔سماعتی فریکوئنسی کو جس حد تک ہم استعمال کرتے ہیں،اس کے مطابق فضا میں پھیلی ہوئی لہروں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ نے اپنے دوست سے بات کی۔دونوں ایک دوسرے کی آواز فریکوئنسی ایک ہونے کی وجہ سے سنتے ہیں۔اگر کسی ایک کی سماعت کی فریکوئنسی کم ہو جائے تو وہ دوسرے کے بولے گئے لفظ نہیں سن سکتا۔فریکوئنسی زیادہ ہونے کی صورت میں وہ الفاظ بھی سن لئے جاتے ہیں جو ادا نہیں ہوئے مگر دل میں موجود ہیں۔وجہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں،اس کی لہریں پھیل جاتی ہیں اور ماحول میں رہتی ہیں۔فرد کی سماعتی رینج جہاں تک ہے،اس کے مطابق مفہوم منکشف ہوتا ہے۔

فرد بات کرنے کے لئے الفاظ کی مدد سے گفتگو کرتا ہے۔ جب وہ خود سے باتیں کرتا ہے تو اس وقت زبان سے نہیں بولتا لیکن جو کچھ بولتا ہے،الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔الفاظ محدودیت ہیں اور فرد محدودیت سے واقف ہے،مفہوم لہروں کی شکل میں الفاظ کے بغیر کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔جس وقت ذہن میں ان لہروں کو سننے کی سکت پیدا ہوتی ہے،لہروں میں ڈائی مینشن نمایاں ہو جاتی ہیں۔

سننے کا عمل چاہے جس زون میں بھی ہو،کسی نہ کسی آواز یا لفظ کی شکل میں ہوگا۔وجہ یہ ہے کہ لامحدودیت بھی اپنے زون میں محدودیت ہے یعنی ہر درجہ سے پہلے ایک درجہ ہے۔مخلوق عرفان کے کتنے ہی اعلیٰ درجہ پر کیوں نہ پہنچے،وہ مخلوق ہے اور مخلوق محدود ہے۔

ہر زبان میں حروف کی تعداد مختلف ہے۔پراہا اور اموندا وا — امیزون کے جنگلوں میں آباد دو قبائل ہیں۔امیزون کا یہ علاقہ برازیل کی حدود میں ہے۔ان قبائل میں جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ کی قلت اور فقدان ہے۔

برازیل کی ایک یونی ورسٹی کے نفسیات اور لسانیات کے دو پروفیسروں نے امیزون کے جنگلوں میں رہنے والے قبائل کی زبانوں کا مطالعہ کیا۔انہوں نے اموندا وا قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ چند ہفتے گزارے اور بتایا کہ ان لوگوں کی زبان میں ''اگلے ہفتہ'' یا ''پچھلے سال'' وغیرہ کے لئے کوئی لفظ نہیں اور نہ ان میں عمر کا تصور ہے۔دونوں قبائل میں الفاظ کی قلت کی ایک وجہ جدید دنیا سے رابطہ نہ ہونا ہے۔

سوال ہے کہ کیا کسی زبان میں زیادہ یا کم الفاظ ہونے سے فرق پڑتا ہے—؟

قوت تخیل پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ الفاظ کے استعمال سے سوچنے کی صلاحیت کم زور ہوتی ہے۔ خیال اپنے اظہار کے لئے الفاظ کا پابند ہو جائے تو اس کی وسعت متاثر ہوتی ہے کیوں کہ خیال ٹائم اور اسپیس

میں رہ کر ظاہر ہونے کے باوجود الفاظ کے مقابلہ میں ٹائم اور اسپیس سے بہت حد تک آزاد ہے۔

آپ کے ذہن میں دنیا کا ایک خاکہ ہے، اس کو الفاظ کا روپ دینے کے باوجود الفاظ ذہن میں موجود خاکہ کی درست تصویر کشی سے قاصر ہیں۔ اگر مصوری کی مشق ہے تو ذہن میں تصویر ہو بہو کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے۔ شے ذہن میں ہو یا سامنے، تصویر میں ظاہر ہوتی ہے۔ لفظ اور تصویر دونوں محدود ہیں لیکن تصویر سے خیال کی وسعت کم سے کم متاثر ہوتی ہے — جس کے سامنے چاہیں تصویر رکھ دیں، سب کے ذہن میں ان گنت خیالات آئیں گے اور تصویر میں کھو کر سب تصویر کی دنیا میں داخل ہو جائیں گے۔

تصویر کشی کو الفاظ کی ضرورت نہیں بلکہ الفاظ کی وضاحت کے لئے تصویر کشی کی جاتی ہے۔ کسی کو لفظ کھانا سمجھ میں نہ آئے تو ہاتھ کے اشارہ سے بتایا جاتا ہے یعنی تصویر بنائی جاتی ہے کہ بھوک لگی ہے، کھانا کھانا ہے۔

کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا علم حاصل کرنے والی مقرب بارگاہ ہستیاں بات کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کی پابند نہیں، وہ کائناتی زبان یعنی لہروں سے واقف ہوتی ہیں۔ ایک مثال حضرت نانا تاج الدینؒ کی ہے۔ ان کے نواسہ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

''نانا تاج الدینؒ صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نکتے بیان کر جاتے تھے جو براہ راست قانون قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ بعض اوقات اشاروں اشاروں ہی میں وہ ایسی بات کہہ جاتے جس میں کرامتوں کی علمی توجیہ ہوتی اور سننے والوں کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی کرامت کے اصولوں کا نقشہ آ جاتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین من وعن ہر وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کر لیتے ہیں جو نانا تاج الدینؒ کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔''

لہروں کی زبان ارتقا و تنزل سے نہیں گزرتی۔ وہ جس حالت میں پہلے تھی، آج بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں پہلے کسی کو جہاز بنانے کا خیال آیا، صدیوں بعد کسی نے اسی خیال پر تفکر کر کے تیز رفتار جہاز بنا لئے۔ البتہ جو زبانیں الفاظ پر مشتمل ہیں، وہ ارتقائی مراحل سے گزرنے کے بعد ترقی اور تنزل کی جانب گامزن رہتی ہیں۔

زبان کی ترقی اور زوال کا اصول ہے کہ جس خطہ کی معیشت زوال پذیر ہوگی، جس خطہ پر جدید معاشروں کی معیشت اور ثقافت کا غلبہ ہوگا، ایسے معاشرہ میں بولی جانے والی زبانیں معدوم ہو جائیں گی۔ صرف وہ زبانیں باقی رہیں گی جنہوں نے روحانی اور سائنسی دنیا میں ترقی کی ہوگی۔

الفاظ کے بغیر پیغام کو منتقل کرنے کی صلاحیت کیسے

حاصل کی جائے ــــ؟

یہ بات بہت اہم ہے کہ ہمارا ذہن تصویر کی طرح سوچتا ہے اور اس کا کام الفاظ مرتب کرنے کے بجائے تصور کرنا ہے۔ اس قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم لہروں کی زبان سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں الفاظ کے بجائے ذہن کی اسکرین پر بننے والی تصویروں پر غور کرنا ہوگا۔ یہ تصویریں اسکرین پر ظاہر ہونے سے پہلے کہاں ہوتی ہیں، کون سی قوت اور عمل انہیں متحرک اور منعکس کرتا ہے اور انعکاس کے بعد یہ تصویریں کہاں چلی جاتی ہیں۔

غور کرنے سے یہ نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ اسکرین پر تصویر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اندر میں کوئی مفہوم کھلتا ہے۔ مفہوم کھلنے سے جسم کو سگنل جاری ہوتا ہے۔ ہم اس سگنل کو اندر کی آواز کا نام دیتے ہیں۔

۲۔ مفہوم تصویر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ فرد تصویر کو ماحول کے مطابق نام دیتا ہے۔

۴۔ اسکرین پر عکس ظاہر ہونے کے بعد غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا عکس آتا ہے۔

اس عمل پر غور کرنے کے لاشمار فوائد ہیں۔ بہترین فائدہ یہ ہے کہ بندہ اندر کی آواز کو سننا شروع کر دیتا ہے۔ سماعت سے مشاہدہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں اس صلاحیت کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے۔

''اور اسی طرح ہم نے اپنے امر سے روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اسے تمہارے لئے نور بنایا۔ اس سے ہم راہ دکھاتے ہیں، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔'' (الشوریٰ:۵۲)

فرد کے لئے دنیا اس وقت تک ہے، جب تک اس کے اندر محسوس کرنے کی حس ہے۔ اندر کی آواز کو سننے کی مشق سے ہم محسوسات کی اس دنیا میں داخل ہوں گے جس کو بیان کرنے کے لئے کسی زبان میں الفاظ نہیں، وہاں صرف مشاہدہ کی رسائی ہے۔

کتبہ پر تحریر لکھوائی

ابن الاثیر جزری نے بچپن میں والد کی ایک درویش سے گفتگو سنی۔ درویش نے فرمایا کہ کام میں ہمیشہ محتاط رہنا اور یہ ضرور سوچنا کہ آنے والی نسلیں تمہارے بارے میں کیا کہیں گی۔ والد نے کہا، جب میں مر جاؤں گا تو مجھے لوگوں کی رائے سے کیا فرق پڑے گا۔ بیٹا درویش کی نصیحت نہیں بھولا۔ کوشش کی کہ اچھے کام کرے، لوگوں کی مدد کرے اور معاشی و سماجی ذمہ داری لگن سے انجام دے۔ خدمت خلق کی وجہ سے وہ معروف ہوا۔ کئی ایسے اقدامات کئے جس سے قصبہ کے لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہوا۔ موت سے قبل اپنا کتبہ تیار کروایا جس پر تحریر لکھوائی ــــ ''وہ زندگی جو موت کے ساتھ ختم ہو جائے، ایسی زندگی ہے جو احسن طریقہ سے نہیں گزری اور اس کا حق ادا نہیں کیا گیا۔''

بزرگوں کی تعظیم

مولانا جلال الدین رومیؒ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش کشتی میں سوار تھے۔سفر کے دوران ایک صاحب کی اشرفیوں کی تھیلی گم ہوگئی۔لوگوں نے درویش پر شبہ کیا، جانتے ہوئے کہ وہ درویش ہے اور کہا کہ ان کی گدڑی کی تلاشی لی جائے۔

درویش پر چوری کا الزام لگا تو اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ اے میرے فریادرس! اے ہر دعا کے قبول کرنے والے، اے میری جائے پناہ! یہ نادان مجھ پر تہمت لگا رہے ہیں۔۔۔ مدد فرما۔

دعا نے اثر کیا اور یکا یک سمندر میں سے متعدد مچھلیاں سطح آب پر آئیں اور پانی سے منہ باہر نکالا۔ ہر مچھلی کے منہ میں ایک قیمتی موتی تھا۔کشتی والے سکتہ کی کیفیت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔درویش آگے بڑھے اور چند موتی کشتی میں ڈال دیئے اور چھلانگ لگا کر پانی پر اس طرح جا بیٹھے جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے۔

درویش کے جاتے ہی کشتی نیچے جانے لگی تو لوگوں کو غلطی کا احساس ہوا اور شور مچ گیا۔

درویش نے فرمایا، ہم نے کشتی کو چھوڑا اور اللہ پر توکل کیا۔۔۔ اللہ نے پانی اور آبی مخلوق کو ہماری حفاظت پر مامور کر دیا۔اب تمہیں چور سے نجات مل گئی ہے۔الزام لگانے سے نقصان کس کا ہوا۔۔۔؟ میں تو خوش ہوں کہ مخلوق سے جدا ہوا تو اللہ سے ملا۔

لوگوں نے معافی مانگی۔درویش نے معاف کر دیا۔کشتی والوں نے عرض کیا، آپ کو یہ مرتبہ کیسے ملا؟

فرمایا، بزرگوں کی تعظیم سے! کیوں کہ میں درویشوں سے کبھی بدگمان نہیں ہوا۔

حاش للہ بل ز تعظیم شہان
کہ نبودم در فقیران بد گمان

سبق: اللہ کی قسم میں نے بزرگوں کی تعظیم کی ہے اور کبھی فقیروں سے بدگمان نہ ہوا۔

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ وچمن، عروج وزوال، عشق وسرمستی اور فنا وبقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چٹانوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا تعلق عرب نژاد پاکستانی خاندان سے تھا۔ اس کی بڑی بہن روما کی شادی پاکستان میں ہوئی۔ یہاں ردا کی نیلم سے دوستی ہوئی۔ نیلم کے گھر ذکر وفکر کی محفل میں ردا کی ملاقات بزرگ سے ہوئی جن کی شفقت اور توجہ نے ردا کی طبیعت میں روحانیت کی طرف میلان پیدا کر دیا۔ والد کے تبادلوں کی وجہ سے ردا اور نیلم کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا۔ ردا نے برطانیہ کی ایڈن برگ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں کاربن ڈیٹنگ کے پروفیسر جی آر چوہان کے لئے ردا کی شخصیت معمہ تھی۔ واقف ہونے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ردا نے پی ایچ ڈی کا فیصلہ کیا۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل آخری مراحل میں تھی کہ ایک مرتبہ پھر ردا کے والد کا پاکستان تبادلہ ہو گیا۔ اب آگے پڑھئے۔

ابو پہلے بھی میری اتنی زیادہ تعلیم کے حامی نہ تھے۔ اس لئے انہیں تھیسز ادھورا رہ جانے کا دکھ نہیں تھا اور میرا یہ حال تھا کہ دنیا اجڑ گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کرتی کہ کوئی صورت بن جائے۔ دعائیں مقبول بارگاہ ہوئیں۔ سپروائزر پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ ملیکان نے خود رابطہ کیا۔ بڑے بہنوئی اسماعیل نے تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ والد خاموش ہو گئے۔ اس طرح اللہ کی مہربانی سے ناممکن دکھائی دینے والا مرحلہ ممکن ہو گیا۔

اسلام آباد سے متصل ٹیکسلا میں صدیوں پر محیط تاریخ دفن ہے۔ اس سائٹ کو یونیسکو نے حفاظتی ورثہ کے طور پر اپنی نگرانی میں لیا ہوا ہے۔ اس حوالہ سے پاکستان کا آرکیولوجیکل ڈپارٹمنٹ بھی متحرک ہے۔ یہاں تحقیق کے بہت مواقع ہیں۔ کہا جائے کہ آرکیولوجی میں تحقیق کرنے والوں کے لئے ٹیکسلا جنت ہے تو غلط نہ ہوگا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سالکین روحانیت کے لئے بھی یہ مقام حیرت کدہ سے کم نہیں۔

تقریباً 6 لاکھ 78 ہزار نفوس پر مشتمل یہ شہر گزشتہ ثقافتوں کے بیش بہا راز سموئے ہوئے ہے۔ 3100 قبل مسیح کی تہذیب وتمدن کی امین یہ سرزمین معاشی، معاشرتی، مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ کئی ثقافتوں کا

مرکز رہی ہے۔

سن عیسوی کی ابتدا ہوئی تو اس وقت گندھارا تہذیب کا مرکز ٹیکسلا تھا۔ اس کا شمار خوش حال خطوں میں کیا جاتا تھا۔ یہاں کی درس گاہوں میں جولیان اور دھرماراجیکا قابل ذکر تھیں جو تشنگان علم کے لئے کسی ذخیرہ سے کم نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشرق بعید، وسطی ایشیا اور ہندوستان کے علاوہ دور دراز ممالک کے طلبا یہاں کا رخ کرتے۔ ٹیکسلا امن وسکون کی سرزمین تھی، کئی مذاہب کے ماننے والے مل جل کر رہتے تھے۔ جب یہاں کی خوش حالی کی داستانیں عام ہوئیں تو یہ خطہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں آ گیا۔

سن عیسوی کے ابتدائی دور میں پہلوی جنگجوؤں نے راجا ایزس ثانی کو شکست دی اور یہاں قابض ہو گئے۔ پہلویوں نے گونڈوفیریز (Gondophares) کی قیادت میں سلطنت قائم کی۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے ایک شاگرد سینٹ تھامس نے یہاں آ کر دینی تعلیمات کا پرچار کیا۔ گونڈوفیریز اور درباریوں نے ان کی شخصیت اور تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ آج بھی ٹیکسلا کی آبادی کا ایک حصہ اور اس میں قائم ایک چرچ سینٹ تھامس کے نام سے منسوب ہے۔

ٹیکسلا کا شمال مشرقی حصہ سرسبز وشاداب پہاڑوں اور فلک بوس چٹانوں پر مشتمل ہے۔ پہاڑوں کے درمیان سے بہتے ہوئے دریائے ہرو* اور پھر خان پور ڈیم وادی کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔

دریائے ہرو کے کنارے قائم بھا مالا اسٹوپا بھی کبھی تشنگان علم کی پیاس بجھانے کا ذریعہ تھا جب کہ جنوبی سرے پر قائم کنال اسٹوپا اشوک کے بیٹے راج کمار کنال سے منسوب ہے۔ اس سے منسلک روایتی کہانیاں یہاں کے لوگ سناتے ہیں۔ یہ جگہ سرکپ کے نام سے مشہور ہے اس سے بھی کچھ کہانیاں منسوب ہیں۔ یہ شہر باختر سے آئے یونانیوں نے بسایا تھا۔

دھرماراجیکا بدھ بھکشوؤں کی درس گاہ تھی جس کا شمار برصغیر کے قدیم ترین اسٹوپا میں ہوتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق اس کی اصل وجۂ شہرت بدھا صاحب کے تبرکات ہیں جو یہاں محفوظ کئے گئے تھے۔ تقریباً 460 عیسوی تک یہ خطہ خوش حالی کا سفر طے کرتا رہا جس کا ثبوت یہاں سے برآمد ہونے والے خزانے ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں وائٹ ہُنوں (white Huns) نے حملہ کر دیا۔ حملہ کا نتیجہ تھا یا قدرتی آفات — تاریخ ابہام کا شکار ہے، گندھارا تہذیب کے دبستانِ فن کے مراکز تہس نہس ہو گئے۔

آرکیالوجی آف انڈیا کے ڈائریکٹر سرجان مارشل 1913ء میں یہاں تعینات ہوئے تو انہوں نے ٹیکسلا میں مدفون باقیات کی تلاش میں کھدائی کا آغاز کیا۔ اس

*دریائے ہرو (ایبٹ آباد سے شروع ہونے والا ایک دریا جو دریائے سندھ میں گرتا ہے)

حوالہ سے ان کی خدمات قابل تعریف ہیں ۔ انہوں نے تاریخ کے بھیدوں پر پڑی پُراسراریت کی گرد کو جھاڑنے کی کافی کوشش کی ۔ بہت کچھ آشکار ہوگیا مگر بہت کچھ آشکار ہونا باقی ہے ۔

وقت مسلسل تاریخ کو پُراسراریت میں دفن کر رہا ہے ۔ ٹیکسلا کا نام انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں شاہ کی ڈھیری تھا ۔ یہ ٹیکسلا کی بدقسمتی ہے کہ یہاں سرجان مارشل جیسا دوسرا افسر نہیں آیا ۔

سکندر اعظم فتح کا جھنڈا لئے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوا تو ساتھ آنے والوں نے ٹیکسلا کے بارے میں کافی کچھ لکھا ۔ ان میں قابل ذکر نام سکندر کے جرنیل نیارکس (Nearchus) کا ہے جس کی تصنیف کے کچھ حصے ہم تک پہنچے ہیں ۔ سکندر کے بعد دوسری یا تیسری دہائی کے دوران یونانی سفارت کار میگاستھنیز (Megasthenes) جو چندر گپت موریا کے دربار میں سفیر بن کر آیا اور ایک دہائی سے زیادہ عرصہ یہاں تعینات رہا ۔ اس نے واپسی پر کتاب Indika تحریر کی جس کی حیثیت ٹیکسلا کی تاریخ کے حوالہ سے خزانہ ہے ۔

تاریخ میں اتنی وسعت ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں ، الفاظ ختم نہ ہوں ۔ لگتا ہے کہ مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس کا ہم زاد بے چینی سے مجھے دیکھ رہا ہے لہٰذا اس قصہ کو یہیں چھوڑ کر اصل کہانی کی طرف آتی ہوں ۔

تھیسز کی تکمیل کے لئے سب سے مناسب جگہ دھرما راجیکا اسٹوپا درس گاہ تھی ۔ دوسرا مرکز جولیان تھا ۔ جگہ کے انتخاب کے بعد جب تصویریں پی ایچ ڈی کے سپروائزر پروفیسر ڈیوڈ بلیک ملیکان کو اجازت نامہ کے لئے بھیجیں تو وہ متاثر ہوئے اور فوری طور پر ایڈن برگ یونی ورسٹی کی جانب سے پاکستان آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کو تحقیق میں تعاون کے حوالہ سے خط لکھا اور اس کی ایک کاپی مجھے ارسال کی ۔ اجازت نامہ ملنے کے بعد کام کی ابتدا میں نے دھرما راجیکا اسٹوپا سے کی جس کی تعمیر کشان دور حکومت میں ہوئی تھی ۔

سردیاں عروج پر تھیں ۔ بارش نے موسم کی شدت میں اضافہ کردیا تھا ۔ لوگ کام کے بعد گھر پر رہنے کو ترجیح دیتے ۔ میں تحقیق کے جنون کے ساتھ ٹیکسلا کی جانب عازم سفر تھی ۔ ڈرائیور بابا ہمارے ساتھ رہتے تھے ، ان کے اہل خانہ گاؤں میں تھے ۔ پارکنگ کے لئے مختص جگہ پر گاڑی کھڑی کرکے بولے ، بیٹا ! سخت ٹھنڈ لگی ہے ، بیمار ہوجاؤں گا ۔ تم جاؤ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں ، ضرورت پڑے تو فون کردینا ، میں آجاؤں گا ۔ یہ سیڑھیاں سیدھی اسٹوپا کی جانب جاتی ہیں ۔

ٹھیک ہے بابا ۔ کہتے ہوئے بیگ اٹھایا اور گاڑی سے اتر گئی ۔ قدم باہر رکھتے ہی سردی کی لہر وجود میں داخل ہوکر ہڈیوں میں اتر گئی لیکن مجھے اس موسم کو برداشت کرنا تھا ۔ رخ سیڑھیوں کی جانب تھا جن کی تعمیر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ یہاں کسی ذی نفس کی موجودگی بعید از قیاس محسوس ہوئی مگر میں آگے بڑھتی گئی ۔ اوپر پہنچی تو

ویرانوں نے استقبال کیا۔اپنی تباہی پر نوحہ کناں وہ کھنڈرات جن پر جمی وقت کی گرد انہیں معدوم کرتی جارہی تھی، میرے منتظر تھے۔سیاہ بادلوں نے سورج کو ڈھانپ لیا تھا اور دن میں بھی اندھیرا غالب تھا۔

چند قدم چلنے کے بعد چوکیدار کی کھولی کے بند دروازہ کی درزوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی اندر اس کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔شاید منجمد کر دینے والی سردی سے بچنے کے لئے وہ ہیٹر چلا کر رضائی میں دبکا ہوا تھا۔اس سے ابھی ملنا ضروری نہیں تھا۔مجھے وہ جگہ منتخب کرنا تھی جہاں سے کام شروع کر سکوں۔

بارش کسی بھی لمحہ ہو سکتی تھی۔اسٹوپا بڑے رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ جلد از جلد کام ختم کروں۔موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوئیں۔لگتا تھا کہ آج اسلام آباد سے ٹیکسلا آنے کی محنت رائیگاں جائے گی۔دوڑ کر قریب موجود گھنے درخت کے نیچے آئی لیکن درخت کی ساری دھول مٹی پانی میں شامل ہو کر مجھ پر گرتی تو میرا نیا اوورکوٹ خراب ہو جاتا۔اس خیال سے کچھ فاصلہ پر قائم چھوٹے اسٹوپا پر نیلے رنگ کے شیڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔

میرا رخ شیڈ کی طرف تھا لیکن پشت کی طرف درخت سے بیک وقت کئی لوگوں کے کودنے کی آواز کا احساس ہوا۔دل حلق میں آ گیا۔بھاگتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔شیڈ تک پہنچ کر جان میں جان آئی۔بارش کی جل ترنگ اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے عجیب ماحول بنا دیا تھا۔اندھیرا بڑھ رہا تھا۔سردی کی شدت تھی یا انجانا خوف—وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔

اچانک موبائل کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف ڈرائیور بابا خیریت دریافت کر کے واپسی کا کہہ رہے تھے۔میں نے چاہا کہ انہیں اندر بلالوں مگر اس موسم کو برداشت کر کے گاڑی سے یہاں آنے کا فاصلہ طے کرنا بوڑھی ہڈیوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔انہیں تسلی دی کہ بارش کی شدت کم ہو تو آتی ہوں۔فون بند کیا ہی تھا کہ اسٹوپا کے عین اوپر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ایک مرتبہ پھر خوف کی سرد لہر وجود میں دوڑ گئی۔

ہمت کر کے دیکھا — کچھ نظر نہیں آیا۔لیکن چھٹی حس بار بار متنبہ کر رہی تھی۔اس وقت اس جگہ کو چھوڑنا بے وقوفی تھی۔میرے پاس چھتری تھی نہ برساتی کوٹ، گھر بھی نزدیک نہیں تھا کہ گیلے کپڑے سخت سرد موسم میں فوری تبدیل کئے جا سکتے۔

گھر سے یہاں کا فاصلہ 35 کلومیٹر سے زیادہ تھا۔دل چاہا کہ آنکھیں بند کر کے بارش رکنے کا انتظار کروں۔اس اثنا میں ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دیں۔شاید دور کہیں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔کان آواز کی سمت کا تعین کر رہے تھے،نظریں پانی کی بوچھاڑ پر جمی ہوئی تھیں کہ اس بوچھاڑ میں سے زرق برق لباس میں سر پر شاہی کلاہ سجائے شہزادوں کی مانند ایک شخص دکھائی دیا۔بارش میں کھلے مقام پر کھڑا ہو کر وہ بارش سے محفوظ تھا۔

میں یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی کہ کہیں آنکھوں کا دھوکا نہ ہو۔ یہ پروفیسر جی آر چوہان کے دفتر میں پیش آئے واقعہ جیسا تجربہ تھا، اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں بائیں حرکت کا احساس ہوا، غور سے دیکھا تو دسیوں دبلے پتلے تیز رنگت والے آدمی جن کی کمر جھکی ہوئی تھی، لنگوٹ باندھے ڈھول کی تھاپ پر مسخروں کی طرح بے ہنگم اچھل کود رہے تھے۔

میں مبہوت تھی، حیرت زدہ اور خوف زدہ بھی۔ عجیب تماشا تھا۔ بارش نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ نہ آسمان پر سیاہ بادلوں کا راج اور نہ گڑگڑاہٹ کی آواز تھی۔ میں شیڈ کے نیچے ساکت و جامد لاشعوری واردات سے گزر رہی تھی، مادی حواس معطل تھے۔ حواس کے غیر مادی رخ نے ماضی سے متعلق کسی منظر کو یہاں واضح کر دیا تھا۔

شاہی عروسی لباس میں ملبوس دلہا نے میری طرف بڑھتے ہوئے کچھ کہا، پہلے پہل سمجھ میں نہیں آیا مگر الفاظ کی تکرار اور میرے غور سے سننے پر اندازہ ہوا کہ وہ اپنی دلہن کو تلاش کر رہا ہے۔ مجھ سے مخاطب تھا کہ نہایت دبلا شخص اچھلتا کودتا درمیان میں آ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا، یہ کہتا ہے میں زندہ ہوں میری دلہن لاؤ — پھر قہقہے لگاتا ہوا اچھلتا کودتا پیچھے کی طرف دوڑ گیا۔ موبائل فون کی بہت ہلکی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تو توجہ منظر سے ہٹ گئی اور منظر اوجھل ہوگیا۔

بارش ہلکی بوندوں میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ہر طرف پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی۔ فون کی گھنٹی تیز ہوگئی۔ جلدی سے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا تو دوسری طرف ڈرائیور بابا تھے۔

بیٹا خوب خاطر کی آج آپ نے، کم از کم فون اٹھا لینا چاہئے۔ میں نے واپسی کا بتا کر فون بند کر دیا۔ موبائل کی گھڑی کے مطابق مجھے یہاں دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس دوران ڈرائیور بابا سات مرتبہ فون کر چکے تھے۔ حالاں کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ چند لمحوں کا منظر تھا۔ تیز قدموں سے باہر کی جانب لپکی۔ راستہ طویل اور گیلا تھا، سنبھل سنبھل کے آگے بڑھتی رہی۔

سیڑھیوں سے راستہ صاف تھا مگر ایک جگہ چھوٹا پل آیا جس کے نیچے پانی کی گزرگاہ تھی۔ شدید بارش کی وجہ سے پانی پل کے اوپر سے بھی گزر رہا تھا۔ دوسری جانب ڈرائیور بابا ہاتھ میں موبائل تھامے پریشانی کے عالم میں راستہ پر نظر جمائے کھڑے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اطمینان کی رمق دور سے ان کے چہرہ پر محسوس ہوئی۔

مسئلہ اب پانی کے ریلے میں سے گزرنے کا تھا۔ سردی سے کپکپی طاری تھی۔ ایسے میں منجمد کرتے پانی میں پاؤں ڈالنے کی ہمت نہیں تھی مگر موسم کے تیور پانی اترنے کا انتظار کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ مجبوراً جوتے ہاتھ میں پکڑے اور پائینچے اونچے کر کے آگے بڑھنا شروع کیا۔ باوجود تمام احتیاط کے کپڑے بھیگ گئے۔ جیسے تیسے گاڑی تک پہنچی۔ گاڑی میں بیٹھتے

ہی ڈرائیور بابا نے اپنی گرم چادر سے میرے پاؤں اچھی طرح ڈھانپ کر ہیٹر چلا دیا۔ اس دوران امی کے فون ڈرائیور بابا کے پاس آتے رہے، وہ بھی فکرمند تھیں۔ گھر پہنچی تو جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ کیسے گاڑی سے اتری اور کمرے تک پہنچی، حافظہ بتانے سے قاصر ہے۔

بازو میں انجکشن کی چبھن محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھولیں تو والدہ اور بہن روما کو پریشان دیکھا جب کہ ڈاکٹر ابو کو دواؤں سے متعلق ہدایات دے رہے تھے۔ ڈرائیور بابا مجرموں کی طرح ایک طرف کھڑے دکھائی دیئے۔ لگتا تھا وہ بے قصور ڈانٹ کے مرحلہ سے گزر چکے تھے۔

قصور وار میں تھی۔ میری باری کا انحصار میرے ٹھیک ہونے پر تھا کیوں کہ میں اس موسم میں جانتے بوجھتے ٹیکسلا گئی۔ خوف کی وجہ سے سارا ہفتہ عجیب وغریب خواب نظر آئے۔ طبیعت کی خرابی سے اتنا فائدہ ہوا کہ کسی نے تفصیلات نہیں پوچھیں۔ ڈرائیور بابا نے ایک آدھ بار پوچھنے کی کوشش کی تو میں نے بات گول مول کر دی۔ جو دیکھا تھا وہ مراقبہ جیسی کیفیت تھی۔

پروفیسر جی آر چوہان کے کمرے میں رنگوں کو دیکھنے کے تجربہ سے ذہن اکثر چیزوں کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھنے لگتا۔ خالی الذہن ہوتے ہی مادی حواس معطل ہو جاتے۔

قدیم طرز کے شہزادوں جیسے لباس میں ملبوس نوجوان کا چہرہ آنکھوں میں تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا کہ

دو کی گنجائش

نوجوان باطنی علوم کی تلاش میں مکتب میں داخل ہوا۔ کئی روز گزر گئے لیکن استاد نے خاص توجہ نہیں دی۔ ایک روز ہمت کر کے پوچھا، جناب! کچھ طالب علموں پر آپ کی نوازش زیادہ ہے۔ میں آپ کے قریب کیسے ہو سکتا ہوں؟ روحانی استاد نے فرمایا، جب میں اور آپ کی قید سے آزاد ہو جاؤ گے ـــ محبت کے کوچہ میں دو کی گنجائش نہیں!

درمیان میں لنگوٹ باندھے وہ بوڑھا آدھمکا جس نے شہزادہ کو پاگل قرار دیا۔ وہ سب کیا تھا ذہن مسلسل سوچ بچار کا شکار رہا۔ والدین کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں وہ مجھے تحقیق سے روک نہ دیں۔

ایسے میں بچپن کی سہیلی نیلم تھی جس سے بات کی جا سکتی تھی۔ شاید اسے بھی بتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجھے ایسے شخص کی راہ نمائی درکار تھی جو ان معاملات کو سمجھتا ہو۔

یکا یک ذہن میں باریش روشن چہرہ آیا۔

ہاں! وہ میری مدد کر سکتے ہیں۔ بچپن میں انہوں نے آدھی کھجور کھلائی تھی اور شربت کا گلاس دیا تھا۔

نیلم سے رابطہ ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اسے ہمارے پاکستان منتقل ہونے کی خبر نہیں تھی۔ گھر یاد تھا مگر رابطہ نمبر نہیں تھا۔ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ بزرگ سے ملاقات ہو سکے۔ (قسط: ۲)

وعدہ پورا کریں

ہم اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں۔اس ایک عہد کو پورا کرنے سے شعور لاشعوری دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور مصائب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

میں وعدہ فراموش ہوں۔

دیکھئے! میری پیشانی پر ندامت کی شکنیں ہیں۔ چہرہ پر الجھنیں اور پریشانیاں آشکار ہیں۔آپ دور سے مجھے پہچان سکتے ہیں۔ ہر لمحہ اپنی وعدہ خلافیوں پر دل میں گھلتا رہتا ہوں۔لوگ کہتے ہیں کہ میں ناقابل اعتماد ہوں ۔گھر اور گھر سے باہر ہر جگہ وعدہ کر لیتا ہوں اور جانتا ہوں کہ جس بات کا عہد کیا ہے، اسے پورا نہیں کروں گا، محض ٹال مٹول سے کام لے رہا ہوں پھر بھی انکار نہیں کرتا۔

جی ہاں! میں ہر ایک کی دعوت قبول کر لیتا ہوں، ہر ایک سے ہامی بھر لیتا ہوں، ہر ایک سے وعدہ کر لیتا ہوں اور پھر ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے وعدہ پورا کرتا ہوں ، باقی لوگ منتظر رہ جاتے ہیں۔بعض اوقات مجھ میں انکار کی جرأت نہیں ہوتی اور میں اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہوں کہ وعدہ کیوں کیا تھا، اسی وقت صاف منع کر دیتا یا پھر معذرت کر لیتا۔ بہر حال کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر کے جان چھڑائی یا نہ چاہتے ہوئے اپنا کہا وفا کیا۔

ایک روز شدت سے احساس ہوا کہ لوگ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ بظاہر میری بات سنتے ہیں لیکن ان کی لہریں میرے باطن کو خبر کر دیتی ہیں کہ میرا کہا ان کے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔

۱۔ کیا وجہ ہے کہ میں عہد پورا نہیں کرتا؟

۲۔ میں لوگوں کو جھوٹی آس کیوں دلاتا ہوں؟

۳۔ کیا مجھ میں انکار کی جرأت نہیں؟

۴۔ وعدہ کر کے بھول جانا کیا ہے؟

۵۔ جن لوگوں سے عہد پورا کیا، وجہ میرے نزدیک اہمیت تھی یا مجھے واقعی ان کا خیال تھا؟

۶۔ احساس کیوں نہیں ہوا کہ میں لوگوں کے لئے ناقابل اعتبار ہوں؟

سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔

اب پڑھئے کہ وعدہ خلاف ہونے کا احساس کیسے ہوا ؟ ایک روز میں تاخیر سے آفس پہنچا۔ہال میں داخل ہونے والا تھا کہ اپنا نام سنا۔جن لوگوں کے

ساتھ میں صبح سے شام تک وقت گزارتا تھا وہ مجھے جھوٹا اور ناقابل اعتبار کہہ رہے تھے۔ قدم اندر رکھے تو خاموشی چھا گئی۔ سب نے ہنستے مسکراتے سلام کیا اور تاخیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ آفس میں وہ دن خاموشی سے گزارا۔ گھر پہنچا تو بیگم بیٹے کو سمجھا رہی تھیں کہ ابو آنے والے ہیں پھر باہر لے جائیں گے۔ بیٹے نے جواب دیا، ابو تو جھوٹ بولتے ہیں۔

ساتھ رہنے والے لوگ بالخصوص بچہ باپ کو جھوٹا کہہ دے تو سوچئے کہ باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ بیٹا باپ کی عزت کرے گا؟ بیٹے عادات میں باپ کی کاربن کاپی ہوتے ہیں۔ ان کی طرح چلتے ہیں، اٹھتے، بیٹھتے اور بات کرتے ہیں۔ جب بیٹے کو احساس ہوگیا کہ باپ جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ فراموش ہے تو بچہ جھوٹ اور وعدہ خلافی سے واقف ہوا۔ اب وہ جب چاہے گا ان کا استعمال کرے گا۔

ممکن ہے اس نے لوگوں سے سنا ہو کہ اس کا باپ جھوٹ بولتا ہے اور لوگوں کو جھوٹی آس دے کر بھول جاتا ہے۔ کیا بیٹے کی سبکی نہیں ہوئی ہوگی — ؟ آج اس نے چڑ کر ماں سے کہہ دیا کہ ابو جھوٹ بولتے ہیں۔

مروتاً یا اخلاقاً ''ہاں'' کہہ دینا اور پھر اہمیت نہ دینا بے مروتی اور غیر اخلاقی عمل ہے۔ بچے آئینہ ہیں جس میں باپ ماں اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ بچوں کو ڈانٹنے اور ناپسندیدہ عادت سے روکنے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر میں اپنی شخصیت اور قول و عمل کو دیکھنا چاہتا ہوں تو بچے میرا آئینہ ہیں۔

میں وعدہ پورا کیوں نہیں کرتا؟ کیوں کہ میں بردبار اور خوددار نہیں ہوں۔ دوسرا تو کجا — میرے نزدیک اپنی بات کی اہمیت نہیں۔ وعدہ فراموش کی نظر میں دراصل اپنی وقعت نہیں ہوتی لہٰذا وعدہ خلافی کی صورت میں وہ اپنے ہی قول کو توڑتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں نہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا، سب کی محبت حاصل کرنا چاہتا ہوں، خوش رکھنا چاہتا ہوں اس لئے ہامی بھر لیتا ہوں اور بعد میں بہانا بنا دیتا ہوں لیکن آج بیٹے نے مجھے جھوٹا کہہ دیا!

وعدہ خلافی کرنے والے عموماً جذباتیت اور خود پرستی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں قوت فیصلہ نہیں ہوتی، وہ متذبذب طبیعت رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم رشتوں اور معاملات کو پیسوں اور مفاد میں تولتے ہیں اور حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہم نے وعدہ خلافی کر کے کتنے لوگوں کو مایوس کیا اور ان کی نظر میں اپنا اعتماد کھویا۔ جب کبھی میں ان لوگوں کی طرف پلٹوں گا تو میری موجودگی اور غیر موجودگی کی اہمیت نہیں رہے گی اور اس دن احساس ہوگا کہ میں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

اپنے محاسبہ کے دوران ایک مرحلہ پر میں نے تاویل

پیش کی کہ میں ناگزیر حالات میں وعدہ خلافی کرتا ہوں۔ کسی سے ملاقات کا وعدہ کیا، مصروفیت کے سبب جانہ سکا۔ بچہ سے سیر و تفریح کے وعدہ کے بعد کوئی دوست ملاقات کے لئے فون کرتا ہے، انکار کرنا ممکن نہیں۔ کیا مجھے بچہ کے ساتھ پروگرام کل تک کے لئے ملتوی نہیں کرنا چاہئے؟ بالکل نہیں!

غیر معمولی حالات میں معذرت کی جاسکتی ہے اور مقابل عذر قبول کرلیتا ہے لیکن بیان کئے گئے حالات غیر معمولی نہیں۔ دراصل ہم اپنی دل چسپی کے مطابق کاموں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بچہ سے کیا گیا وعدہ دوست کے فون سے زیادہ اہم ہے۔ بہتر ہے کہ ہامی بھرتے وقت ممکنہ صورت حال سامنے رکھیں اور اعتماد میں لیں کہ زیادہ ضروری کام آگیا تو میری موجودگی ممکن نہیں ہوگی۔ اب وہ حالات کو سمجھے گا اور ذہن دونوں صورتوں کے لئے تیار رہے گا۔

بعض اوقات آدمی ایک چیز کا فیصلہ کرکے حالات کے پیش نظر اسے تبدیل کرتا ہے، یہ وعدہ خلافی نہیں ہے۔ البتہ جان بوجھ کر عذر تراشنا اچھی بات نہیں۔ وعدہ کرنا زبان دینا ہے، ایسا عہد کہ جس کو وقت مقررہ پر پورا ہونا چاہئے۔ اس میں اتفاق یا اہم ضرورت کے سبب تبدیلی کی گنجائش نہیں سوائے سنگین حالات کے۔

چھوٹی بڑی باتوں میں قول کو پورا کرنے کی عادت سے ذمہ داری، تحمل اور بردباری پیدا ہوتی ہے، لوگ ادب واحترام کرتے ہیں۔

۱۔ محبت کرنے والوں سے فائدہ مت اٹھائیے۔ ہزار وعدہ خلافیوں کے باوجود وہ تعلق قطع نہیں کریں گے۔ اس وجہ سے وعدہ کو اہمیت نہ دینا زیادتی ہے۔ وہ عذر قبول کرلیں گے مگر ایسا کرکے ہم نے انہیں احساس دلایا ہے کہ ہماری نظر میں ان کی اہمیت نہیں۔

۲۔ فرض کیجئے دوست کی دعوت قبول کرنے کے بعد کاروباری مصروفیت کی بنا پر معذرت کرلی۔ یہ ہمارے لئے معمولی بات ہے لیکن ممکن ہے کہ میزبان نے روزمرہ اخراجات میں کمی کرکے دعوت کے لئے گنجائش پیدا کی ہو۔ اس صورت میں معمولی نظر آنے والی بات، ناگواری کا سبب بنتی ہے۔

۳۔ بچوں سے کئے گئے وعدہ کو ہرگز مت توڑیں۔ وہ بے چینی اور مسرت سے اس لمحہ کا انتظار کرتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ مایوس اور متنفر ہوسکتے ہیں۔

۴۔ مالی حیثیت کی وجہ سے کسی کو ترجیح مت دیں۔ اس طرح ہم خود کو اخلاقی طور پر کم زور ثابت کرتے ہیں۔

۵۔ صاف گوئی سے اور مناسب لہجہ میں انکار کی عادت ڈالیں۔ یہ وعدہ کرکے پورا نہ کرنے سے کم نقصان دہ ہے۔ ہم بآسانی ان الفاظ میں معذرت کرسکتے ہیں کہ ''مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں یہ کام نہیں کرسکوں گا'' اس طرح ہم غیر ضروری پریشانی یا ندامت سے بچ جائیں گے۔

ٹھہریئے! بات ختم نہیں ہوئی۔

ایک عہد ہم نے روز الست میں کیا تھا، کیا ہمیں وہ عہد یاد ہے؟ خالق اور مخلوق کے تعلق کی بنیاد عہد پر

ہے۔مخلوق نے اللہ کے دیدار سے مشرف ہوکر عہد کیا کہ جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔

رب کے معنی پالنے والا ہے۔ کفالت وحفاظت کرنے والا اللہ ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور پر توکل کرنا عہد شکنی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیوں کہ اللہ کو پرہیز گار لوگ پسند ہیں۔'' (اٰل عمرٰن: ۷۶)

قرآن کریم میں ایفائے عہد کی تاکید ہے۔

''اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔'' (النحل:۹۱)

ایمان — عہد ہے۔ نبی پر ایمان لانا دراصل عہد کرنا ہے کہ ہم ان کی اتباع کریں گے اور زندگی کے کسی مرحلہ پر ان کے حکم سے روگردانی نہیں کریں گے۔ نبی سے عہد — اللہ سے عہد ہے کیوں کہ وہ اللہ کا پیغام لے کر لوگوں کے پاس آئے ہیں۔

ایک مثال بیعتِ رضوان ہے۔

''اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عن قریب اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔'' (الفتح: ۱۰)

خلاف ورزی کی وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ سے کیا ہوا عہد بھول گئے ہیں اور وسائل کو اہمیت دے دی ہے۔

''ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پروا تک نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اللہ کے حضور پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔''

(التوبہ: ۷۵۔۷۷)

ہم بچوں کو آسائش فراہم کرنے کے لئے دن رات محنت کرتے ہیں۔ بچے آسائشوں کو استعمال کرتے ہوئے اگر ماں باپ کے احترام اور حقوق کا خیال نہ رکھیں اور انہیں نظر انداز کر دیں تو ماں باپ کے جذبات کیا ہوں گے؟ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟ ماں باپ اس کے باوجود بچوں کی ضرورت پوری کریں گے لیکن کیا اعتماد قائم رہے گا — ؟

ہم اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں۔اس ایک عہد کو پورا کرنے سے شعور لاشعوری دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور نافرمانی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بھان متی

جنگل میں مقیم ایک جوگی اپنی کٹیا کے قریب رہنے والی چوہیا سے مانوس ہوگیا۔اس کا خیال رکھنے لگا اور باتیں کر کے اپنا دل بہلاتا۔ایک دن چوہیا نے اپنی زندگی سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے جوگی سے فرمائش کی کہ اسے بلی بنادیا جائے۔خواہشات کا سلسلہ دراز ہوا۔اب ان خواہشات کا انجام پڑھیے۔

جوگی کی کٹیا کے پاس پہنچ کر چوہیا پر پرانا خبط سوار تھا۔ہتھنی کے روپ کی برائیاں سامنے تھیں۔اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر رانی ہے۔راجا بھی اس سے پیار کرتا ہے۔رانی سے زیادہ کوئی اونچا ہے نہ اس جیسی کسی کی قدر ہے۔راجا کی رانی بن کر سارے سکھ مل سکتے ہیں۔

جوگی کہیں گیا ہوا تھا۔ہتھنی اس کی راہ تکتی رہی۔

جب وہ آیا تو یہ آگے بڑھی۔ماتھا ٹیک کر سلام کیا۔

جوگی حیران ہوا کہ اتنے دن کہاں رہی۔

گرو جی! کچھ نہ پوچھو جانور بن کر اس چوہیا پر کیا کیا نہیں بیتی۔جانوروں کے روپ میں تو دکھ ہی دکھ ہیں۔

جوگی: پھر؟ اب کس کو دیکھ لیا ہے ــــ؟

ہتھنی: میں چوہیا سے بلی بنی۔بلی سے کتیا۔کتیا سے بندریا۔بندریا سے ہرنی۔ہرنی سے ہتھنی۔پر جو سکھ میں چاہتی تھی کہیں نہیں ملا۔

جوگی: سکھ اس جہاں میں کہاں! سکھ تو خود کو بھولنے سے ملتا ہے۔

ہتھنی: نہیں گرو جی نہیں! مجھے ایک راجا لے کر گیا، فیل خانہ میں رکھا۔اس کی رانی بڑے سکھ سے ہے۔اس زمین پر اگر کوئی خوش رہ سکتا ہے تو صرف رانی بن کر۔

جوگی: یہ تیری بھول ہے۔یہاں اگر کوئی سکھی ہے تو وہ غریب ہے۔امیر تو جھوٹی خوشی مناتے ہیں۔

ہتھنی: پھر آپ نے مجھ پر اتنا کرم کیوں کیا؟

جوگی: بھول ہوئی بھول!

ہتھنی! اب کے پھر بھول سہی۔

جوگی: اری گھڑی گھڑی بھول میں بھلائی نہیں۔

ہتھنی: مجھے مایوس مت کرو۔ایک دفعہ عورت کا روپ دے کر مجھے رانی بنادو۔

جوگی: نادان! جانوروں کے روپ سے نکل کر آدمی کے روپ میں نہ جا۔اس روپ کے پاپڑ تجھ سے نہیں بیلے جائیں گے۔جان سے جائے گی۔

ہتھنی: رہنے دو گرو جی! جانتی ہوں کہ تم یہ روپ نہیں

دے سکتے اس لئے بہانے کر کے ٹالتے ہو۔

جوگی: اری میری صلاحیت کو کھیل مت سمجھ۔ نادان بے وقوف! چولا بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ پر یہ تو سوچ رانی بنانے کے لئے کتنی محنت کرنا ہوگی۔ کسی راجا کو کہاں سے ڈھونڈتا پھروں گا جو آ کر تجھے لے جائے اور رانی بنائے۔

ہتھنی: گرو جی ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔۔۔ بس کی بات نہیں تو ویسے کہہ دو۔

جوگی نے طعنہ سنا تو آنکھیں لال ہوگئیں۔ برتن پاس رکھا تھا، چلو میں پانی لے کر چھینٹا مارا۔ ہتھنی زمین پر گری۔ اور جب اٹھی تو پری زادتھی۔

بی چوہیا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جوگی جی بھی اپنے علم پر قربان ہوگئے۔ چوہیا لڑکی بنی بھی تو ایسی حسین کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ جوگی اس کے لئے حسین لباس کا انتظام کرتا، پھل مٹھائیاں کھلاتا اور آٹھوں پہر اس کی خاطر میں لگا رہتا۔ اس نے اس کا نام ''روپا رانی'' رکھا۔ لڑکی بھی جوگی کو اپنا گرو سمجھتی۔ ہر وقت خدمت میں لگی رہتی لیکن دل میں رانی بننے کی آرزو موجود تھی۔ سوچتی کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ کوئی مجھے اپنے راج پاٹ کا مالک بنائے۔

ایک روز جوگی کہیں دور گیا ہوا تھا۔ روپا رانی جوگی کے انتظار میں کٹیا کے دروازہ سے لگی بیٹھی تصور کی دنیا کا تماشا دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان گھوڑے پر ادھر آیا۔ نظر روپا رانی پر پڑی۔ وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔

غیر مرد سے شرمائی اور دوپٹا سنبھالتے ہوئے بولی، کون ہو تم؟ جوگی جی سے کوئی کام ہو تو ادھر کٹیا کی چھاؤں میں بیٹھ جاؤ۔

اجنبی: اے حسین! خفا نہ ہو، دیکھتی ہو کیسی دھوپ پڑ رہی ہے، پیاسا ہوں، ہو سکے تو پانی پلا دو۔

روپا رانی کو اجنبی آواز مانوس لگی۔ دھیان دے کر جو اس کی صورت دیکھی تو دھک سے رہ گئی۔ یہ سوار وہی راجا تھا جو اسے ہتھنی کے روپ میں پکڑ کر لے گیا تھا آنکھوں کے سامنے ہزاروں رنگ برنگ کے پھول کھلنے لگے۔ گھونگھٹ نکال کر اجنبی کے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی، مہاراج! میں نے آپ کو نہیں پہچانا تھا لہٰذا میری بات کا برا نہ مانیں۔

راجا: اب کس طرح جانا؟

روپا رانی: جب بھاگ کھلتے ہیں تو اپنا راجا پہچان میں آجاتا ہے۔

راجا: تو کیا تمہارے بھاگ کھل گئے؟

روپا رانی: آپ کنڈی کھڑکائیں اور بھاگوں کی کٹیا بند رہے، کیسے ممکن ہے۔ بیٹھیں میں پانی لاتی ہوں۔

روپا رانی پانی لائی۔ راجا نے پیا۔ پانی کی پیاس تو بجھ گئی لیکن دل کی پیاس کس طرح بجھے؟

راجا کی آنکھیں روپا رانی کے حسن کی دھوپ میں برابر چمک رہی تھیں۔ ٹھنڈی آہ بھری اور پوچھا: اچھا تو اب میں جاؤں؟

روپارانی: میں کیسے کہوں۔آپ مالک ہیں۔سلطنت کے حکمران پر جوگی کی لڑکی کا کیا زور۔

راجا: کیا تم سچ مچ جوگی کی بیٹی ہو؟ جوگی تو ان بکھیڑوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

روپارانی: بھولے بھٹکے جیون کو پالنا ان کا کام ہے۔

راجا: پھر تو تم جوگن نہیں بروگن ہو۔تمہاری ذات؟

روپارانی: سنا ہے میں کسی کھشتری کی بیٹی ہوں۔

راجا: کس سے سنا؟

روپارانی: جوگی جی سے۔بگڑے بھاگ کی کہانی ہے۔جب انہوں نے سنائی مجھ کو رونا آ گیا تھا۔

راجا: یاد ہو تو مجھے بھی سناؤ۔

روپارانی: مجھ پر جو گزری وہ تکلیف دہ ہے۔سن کر کیا کرو گے۔کیا رونے کو جی چاہتا ہے؟

راجا: رونا آیا تو میں بھی رولوں گا۔شاید اس کہانی میں محبت کی چمک ہو اور یہ محبت کی کہانی بن جائے۔

روپارانی: نہ سنتے تو اچھا تھا خیر سنو۔

جوگی جی کا کہنا ہے کہ میرے والد بڑے راجا تھے۔ لوگ دشمن ہو گئے، چاروں طرف خون کے پیاسے تھے، ایک رات میری ماں کا ہاتھ پکڑا اور علاقہ سے نکل گئے، دشمنوں سے چھپتے جان بچاتے اس جنگل میں بسیرا کیا۔ وہیں کہیں ڈاکو بھی جمع تھے۔ ان کی نظر میرے والد کے چمکتے ہوئے لباس پر پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ چاروں طرف سے آ پڑے۔ ماں کا زیور اور والد کی جان لے کر گئے۔ میں اس وقت ماں کے پیٹ میں تھی۔ ماں نے ان کو دم توڑتے دیکھا تو برداشت نہیں ہوا۔ میری پیدائش کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ قدرت نے میری زندگی کا یہ سامان کیا کہ درخت پر شہد کی مکھیوں نے چھتا بنا رکھا تھا اس میں سے شہد رسنے لگا۔ ہر بوند سیدھی میرے منہ میں ٹپکتی۔ ایک روز جوگی جی کا وہاں سے گزر ہوا اور مجھے اٹھا لائے اور پال پوس کر بڑا کیا۔

راجا: تمہاری صورت، رکھ رکھاؤ اور شہد سے میٹھے بول بتاتے ہیں کہ تم سچ مچ راج دلاری ہو۔

روپارانی: غریبوں سے مذاق نہ کیجئے۔اب تو اس کٹیا میں رہتی ہوں۔

راجا: جو بیتنی تھی بیت گئی۔ دیکھو کسی راجا کا محل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

روپارانی: اپنا محل نہیں رہا تو پرائے محل کا خواب نہیں دیکھنا چاہئے۔

راجا: رانی اپنے محل میں راج نہیں کرتی، اس کے واسطے دوسرے محل سجتے ہیں۔

اتنے میں جوگی آ گیا، دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر مسکرایا۔ راجا نے اٹھ کر سلام کیا۔

جوگی: بچہ ادھر کیسے آنا ہوا؟

راجا: پیاسا تھا پر پیاس نہیں بجھی اور بھڑک اٹھی۔

جوگی: وہ کیسے ــــ؟

راجا: محبت کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔

جوگی: مایا کے جال میں نہ پھنس۔

راجا: مہاراج! بے بس ہوں۔

جوگی: راجا ہو کر ایسی باتیں؟

راجا: اب تو مجھ پر کرم کرنا ہوگا۔ پھر روپا رانی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس محبت کے دریا کو راج محل میں لے جانے کی اجازت دیجئے۔

جوگی: اس سے شادی کرو گے ــــ؟ پر اس کا روپ تو ــــ کہتے کہتے رک گیا۔ اچھا لے جاؤ۔ ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ جوگی سوچ رہا تھا کہ جسے یہ محبت کا دریا کہتا ہے، اس میں سے پاپ بہے گا۔

مالک کی یہی مرضی ہے۔ جا روپا رانی جا! راجا کے گھر میں رانی بن۔ یہ کہتا ہوا جوگی کٹیا میں چلا گیا۔

راجا اپنی دھن میں ایسا محو تھا کہ جوگی کی بات سنی ان سنی کر دی اور دھیان بھی دیتا تو سمجھتا کیسے!

قصہ مختصر راجا روپا رانی کو ساتھ لے کر خوشی خوشی محل میں آیا۔ بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ راج دربار میں اس کا حکم چلنے لگا، ساری رانیاں دل سے اتر گئیں۔ روپا رانی کے سامنے کوئی انہیں نہ پوچھتا۔

ایک چوہیا کے لئے یہ ارتقا کی آخری منزل تھی لیکن آرزوؤں کا سلسلہ باقی تھا۔ دن رات کشمکش میں گزر رہے تھے۔

ایک رات چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ راجا کو سوتا چھوڑ کر یہ محل کے باغیچہ میں ٹہلنے لگی۔ پھرتے پھرتے کنوئیں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دل میں آیا کہ کنوئیں کے پانی میں اپنی صورت دیکھوں۔ جگت پر چڑھ کر اندر جھانکنے لگی۔ چاند کا عکس تھرتھرا رہا تھا۔ ہچکولے کھانے سے رانی کا سر چکرایا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ پاؤں لڑکھڑائے تو دھڑام سے کنوئیں کے اندر۔

محل میں قیامت آ گئی۔ راجا شور سے اٹھا اور رانی کو غیر موجود پا کر باہر کی طرف بھاگا۔ رانی کی خبر سن کر زمین آسمان ایک کر دیا۔

رانی کو کنوئیں سے نکالا گیا۔ بے جان لاش سامنے رکھی تھی اور راجا خودکشی پر آمادہ تھا۔ خادم، وزیر، امیر اور رانیاں سب منتیں کر رہے تھے۔

چوبدار نے عرض کیا، مہاراج! ایک جوگی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ راجا کو جوگی سے ملنے کا ہوش کہاں تھا جو چوبدار کو جواب دیتا۔ اتنے میں دوسرا چوبدار آیا اور پوچھا، جوگی کے لئے کیا حکم ہے۔

راجا خاموش تھا، سامنے سے ایک جوگی آتا دکھائی دیا۔ راجا صورت دیکھتے ہی جوگی کے پاؤں پر گر پڑا۔

گرو جی! محبت کا دریا خشک ہو گیا۔

جوگی نے راجا کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور روپا رانی کی لاش کو دیکھ کر راجا سے کہا، بھان متی کا ایک کھیل تھا، ہو چکا! تقدیر سے کیا لڑتا ہے۔ ایک جوگی کے ہاتھ کا بویا ہوا بیج راجا کے محل میں پھوٹے گا، یہ لکھا تھا، سو ہوا۔

راجا: گرو جی! ڈھارس دو۔ مجھ سے رانی کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔

جوگی: نادان وہ رانی نہیں، میرے ماتھے پر دھبا تھا۔

راجا: کیا کہہ رہے ہو گرو جی؟

جوگی: ارے وہ میرے غرور کا پھل تھی۔

راجا: جوگ میں بجوگ ــــ؟

جوگی: بجوگ نہیں، جوگ کی ناقدری!

راجا: ایک یہی چولا رہ گیا تھا، اس کا بھرم بھی گیا!

جوگی: یقین رکھ! یقین رکھنے والے کا بھرم نہیں ٹوٹتا۔

راجا: میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا کہتے ہیں؟

جوگی نے نوکروں کے سامنے راجا کی عزت کا بھرم رکھتے ہوئے کچھ کہنے سے گریز کیا اور ایک طرف ہو گیا۔ راجا اشارہ کو سمجھ گیا۔

سب دور ہوئے تو جوگی بولا ــــ

سالوں پہلے میری کٹیا میں کہیں سے ایک چوہیا آ گئی۔ پھدکتی ہوئی اچھی لگی۔ دل میں آیا کہ اگر یہ آدمی کی طرح بولنے لگے تو کیا اچھا ہو۔ وہ بولنے لگی اور میں بھول گیا کہ یہ چوہیا ہے۔ بس پھر کیا تھا میں نے اپنی طاقت آزمانا شروع کر دی۔ اسے چوہیا سے بلی، بلی سے کتیا اور پھر بندریا، بندریا سے ہرنی پھر ہتھنی اور آخر میں ہتھنی سے آدم زاد بنا دیا۔ لیکن یہ میری بھول تھی اور اس بھول کو مجھے ہی بھگتنا ہے۔ اب تو اس کو بھول جا اور راج پاٹ پر دھیان دے۔

راجا: گرو جی اس نے مجھ سے محبت کی۔ محبت کا کوئی تو پھل ہونا چاہئے۔

جوگی: محبت کا پھل۔ اچھا میں اس محبت کو امر بنا دیتا ہوں۔ لاش کو کنوئیں میں ڈال کر پاٹ دو۔ اس کی خاک سے ایسا درخت پیدا ہوگا جس کے پھل میں امرت اور زہر دونوں ہیں۔ یہ کہہ کر جوگی چلا گیا۔

راجا نے روپا رانی کو کنوئیں میں ڈال کر مٹی بھروا دی۔ کچھ روز بعد کنوئیں پر نرالی وضع کا پیڑ بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اس میں لال زرد رنگ کے پودے اور کئی رنگ کے پھول آئے۔ اس کے بعد سبز گیند نما پھل لگے۔ لوگوں نے طرح طرح سے اس کا استعمال شروع کیا۔

آج نہ وہ راجا ہے، نہ جوگی، نہ وہ رانی لیکن وہ درخت موجود ہے۔ اس کا پھول گل لالہ جیسا ہے اور پوست (خشخاش کا ڈوڈا) اس کا پھل۔ افیون اسی پوست میں سے نکلتی ہے۔

اب آپ افیون پینے والوں، افیون کے اعمال و افعال اور ان کی وضع ملاحظہ کر لیں۔ ان جانوروں کی صفات کا مطالعہ کریں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیا وہ عادتیں اندر ہیں؟ پھر جس طرح محبت زہر ہے اور امرت بھی۔ افیون بھی دوا سمجھو تو اکسیر ہے ورنہ موت!

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

(آخری قسط)

خواتین و حضرات! آپ نے کہانی پڑھی۔ طبع آزمائی کیجئے اور بتائیے کہ کیا سمجھے؟

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور و فکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل و دانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

باادب بچو — السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اس مہینہ کا سوال پڑھئے۔

بچہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ چمکتا، دمکتا ستارہ ہے — ستارہ بھی ایسا ستارہ جس کی روشنی کے سامنے دوسرے ستاروں کی روشنی ماند ہے۔ اگلے لمحہ وہ ستارہ آسمان سے گرا اور گول گول دائروں میں گھومتا ہوا تیزی سے زمین کی حدود میں داخل ہوا — ستارہ کو ہزاروں لاکھوں کروڑوں گھروں میں سے صرف ایک گھر میں روشنی نظر آئی۔ وہاں ایک خاتون عبادت میں مصروف تھیں۔ ستارہ کی صورت میں موجود بچہ آہستہ سے ان کی گود میں جا کر گرا اور سو گیا۔ خاتون کی گود میں ستارہ گرتے ہی گھر جگ مگا اٹھا۔

.....

ہم سب یہاں سوتے ہیں تو دوسری دنیا میں آنکھ کھلتی ہے جسے خواب کی دنیا کہتے ہیں۔ وہاں ہم اڑتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، خوب صورت مقامات کی سیر کرتے ہیں، نیک ہستیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور پلک جھپکتے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اگر خواب کی دنیا سے واقف ہو جائیں تو ہم اس دنیا میں خواب کی دنیا کی طرح جہاں چاہیں پہنچ سکتے ہیں۔

اولی الالباب بچو! بتایئے آپ کیسے خواب دیکھتے ہیں؟ جو بچے یا یحییٰ یا قیوم کا ورد کرتے ہیں اور ذوق وشوق سے نعتیں پڑھتے ہیں، انہیں سچے خواب نظر آتے ہیں۔ آپ نے بھی کوئی خواب دیکھا ہے تو لکھ کر ہمیں بھیجئے، آپ کا خواب شائع ہوگا۔ انشاء اللہ!

جون 2019ء میں سوال کیا گیا تھا کہ مٹی میں پانی ڈالنے سے پانی کہاں غائب ہوتا ہے اور مٹی گیلی کیوں ہو جاتی ہے؟ ان چیزوں کے نام بتائیں جن میں خلا ہے۔ مخلوق میں خلا ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟ بچوں کی طرف سے موصول ہونے والے جوابات میں سے منتخب یہ ہیں:

نورالعین۔ جماعت چہارم (اٹک) السلام علیکم بابا جان! آپ نے خلا سے متعلق سوال پوچھا۔ میں نے غور کیا کہ ہر چیز میں خلا ہے۔ مچھلی پانی میں رہتی ہے اور پانی جذب کر لیتی ہے۔ اس کے جسم میں مسام ہوتے ہیں جو خلا کا کام کرتے ہیں۔ کپڑے دھونے کے لئے پانی میں ڈالیں تو بالٹی میں پانی کم ہو جاتا ہے کیوں کہ کپڑے پانی جذب کر لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کپڑوں میں بھی خلا ہے۔ ہم کھانے پینے کی ہر چیز زمین سے لیتے ہیں۔ زمین پانی کو جذب کرتی ہے اور ہمیں پودے، پھل، گندم اور بہت ساری چیزیں ملتی ہیں یعنی زمین میں بھی خلا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر زمین میں سے خلا ختم کر دیں تو سب مر جائیں گے۔

صارم حمید۔ جماعت سوم (جدہ): اسکول بیگ میں خلا ہے۔ کتابیں اندر چلی جاتی ہیں اور بیگ میں سے باہر بھی آتی ہیں۔ پنسل میں بھی خلا ہے۔ جب ہم پنسل چھیلتے ہیں تو اندر چھپی نوک باہر آجاتی ہے۔ ناک، منہ، ہاتھ، پیر سب میں خلا ہے۔

حور بانو۔ جماعت پنجم (لاہور): میں نے مٹی کا پہاڑ بنا کر اس میں پانی ڈالا تو پانی اوپر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سطح کم ہوئی، پانی غائب ہو گیا اور — مٹی گیلی ہو گئی یعنی مٹی نے پانی پی لیا۔ پانی کہیں غائب نہیں ہوا بلکہ مٹی کے اندر موجود ہے۔ جس طرح ہمارے پیٹ میں پانی جاتا ہے اسی طرح ہر جان دار پانی پیتا ہے۔

وجیہہ نثار۔ جماعت چہارم (کراچی): امی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ وہ پانی ڈالتیں تو آٹا سارا پانی پی لیتا۔ امی کہتی ہیں کہ آٹا گوندھنے کے بعد پانی ڈالیں تو اب پانی آٹے کے اندر نہیں جائے گا۔ کیوں کہ آٹے میں مزید پانی جانے کی گنجائش نہیں۔ آٹے کے اندر خلا پانی سے بھر گیا ہے۔ روٹی پکاتے وقت آٹے کے اندر پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے، روٹی کے مسامات کھلتے ہیں اور وہ پھول جاتی ہے۔ روٹی میں بھی خلا ہے۔

(طلحہ خرم، جماعت ہفتم، حیدرآباد): خلا کی وجہ سے ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی ہے اور ہم سانس لیتے ہیں۔ مٹی میں خلا ہے، اس نے سارا پانی پی لیا۔ دادی جان کہتی ہیں کہ مٹی ہماری طرح مخلوق ہے۔ ہم مٹی سے بنے ہیں۔ مٹی میں خلا کی وجہ سے مٹی سے بننے والی چیزوں میں بھی خلا ہے۔

دن چڑھیا بھاگیں بھریا ساڈا نبیؐ مکے وچ وڑیا
اونہیں وڑ دیاں کلمہ پڑھیا پڑھو لا الٰہ الا اللہ
محمدؐ پاک رسول اللہ اللہ اللہ کیا کرو
خالی دم ناں بھریا کرو کلمہ نبیؐ دا پڑھیا کرو
پڑھو لا الٰہ الا اللہ محمدؐ پاک رسول اللہ

اک میرا چاند اک میرا تارا
امی کی لاڈلی ابو کا پیارا
آیا ہے دیکھو بادل کا گھوڑا
بیٹھے گا اس پہ ننھا سا جوڑا
اڑتا پھرے گا رنگیں فضا میں
ٹھنڈی ہوائیں دیں گی جھکوڑا
رہے سلامت تاقیامت جوڑا تمہارا
اک میرا چاند اک میرا تارا
امی کی لاڈلی ابو کا پیارا
اے میرے راجا اے میری رانی
جگ جگ ہو آئے تم پہ جوانی
آنکھوں سے میری اوجھل نہ ہونا
واروں میں تم پہ یہ زندگانی
گھر کی ہو رونق
آنکھوں کی ٹھنڈک دل کا سہارا
اک میرا چاند اک میرا تارا

اس گیت کو پڑھتے ہوئے یقیناً بہت سے قارئین کے لئے سالوں کا فاصلہ چند لمحوں میں سمٹ آیا ہوگا اور بچپن آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ نظر الفاظ پر اور کان اس آواز پر ہوں گے جو اماں جھولے میں لیٹے بچہ کو ہلکورے دیتے ہوئے یا سینہ سے لگا کر آہستہ آہستہ جھومتے ہوئے گاتی تھیں۔

سماعت سے گیت گزرا تو مجھے اپنا نہیں لیکن اپنے بہن بھائیوں کا بچپن یاد آ گیا کیوں کہ میں اس وقت تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتی تھی اور اماں کے پاس بیٹھ کر اپنے بہن یا بھائی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ مجھے گڑیا سے کھیلنا پسند تھا۔ گھر میں جیتی جاگتی گڑیا اور پھر گڈا آیا تو اماں ان کا خیال رکھنے میں اور میں ان سے کھیلنے میں مصروف ہوگئی۔

اس زمانہ میں ''اک میرا چاند، اک میرا تارا'' مقبول ہوا اور لوری بن گیا۔ جن ماؤں کو لوری کی

اہمیت کا اندازہ ہے، وہ اسے مدھر آواز میں گا کر بچوں کو سلاتی ہیں۔

اسلاف سے منتقل ہونے والی روایات میں سے جو روایتیں آج بھی رائج ہیں ان میں سے بیش تر کا تعلق ظاہری رسم ورواج سے ہے۔ ہر دور میں ان رسومات کا اہتمام ہوتا ہے لیکن جو روایتیں تربیت سے منسلک ہیں، وہ وقت گزرنے کے ساتھ مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ان میں ایک بچوں کو لوری سنانا ہے۔

لوری ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وہ گیت یا منظوم الفاظ ہیں جو مائیں بچوں کو سلانے یا خاموش کرانے کے لئے مدھم آواز اور مدھر سروں میں گاتی ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ،

''لوری ہلکا پھلکا گیت ہے جس کی طرز قواعدِ موسیقی کے بجائے سازِ فطرت سے مطابقت رکھتی ہے۔ ہر وہ آرزو جو ماں کے قلبِ صمیم سے نکل کر گیت کے سانچے میں ڈھل جائے، لوری کہلاتی ہے۔لوری خواہ وہ فنِ شعری پر پوری اترے یا محض تُک بندی ہو، مامتا کے جذبات سے معمور ہوتی ہے۔''

بچوں کو لوری سنانے کی روایت ہر تہذیب میں ہے۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کے مطابق دنیا کی معلوم شدہ سب سے پرانی لوری بابلی تہذیب سے کھدائی کے دوران ملی۔ یہ چار ہزار قبل مسیح پرانی بتائی جاتی ہے۔ بابلی تہذیب جس علاقہ میں پروان چڑھی وہ موجودہ عراق کا حصہ ہے۔ دریافت ہونے والی لوری چھوٹی تختی پر تحریر ہے اور لندن کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ لوری کے الفاظ بتاتے ہیں یہ بچوں کو سلانے کے لئے گائی جاتی تھی یعنی لوری کا مقصد ابتدا سے بچوں کو سلانا رہا ہے۔

ہتھیلی سے چھوٹی اس تختی پر موجود تحریر، خط میخی (cuniform script) میں ہے۔ خط میخی کو تحریر کی اولین اشکال میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک اسے پڑھا جاسکا ہے، مفہوم یہ بنتا ہے:

''جب بچہ روتا ہے تو گھروں کا دیوتا ناراض ہوجاتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ خطرناک ہوتا ہے۔''

بچوں کو سلانا یا وقت پر سونے کی عادت ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے البتہ تجربات سے ثابت ہے کہ لوری سن کر بچہ سو جاتا ہے کیوں کہ لوری سناتے وقت ماں کے ذہن میں بچہ کو سلانا ہے۔ ماں کے ذہن سے نیند کی لہریں بچہ کے ذہن میں منتقل ہوتی ہیں۔ بچہ جب ترنم میں پڑھے جانے والے الفاظ کی جانب متوجہ ہوتا ہے، آواز پر دھیان سے یک سوئی پیدا ہوتی ہے اور بچہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ہر دور میں لوری حالات و واقعات اور ماحول کے زیر اثر خیالات کے تحت ترتیب دی گئی۔ بعض لوریوں میں خوف کا عنصر غالب ہے۔

بچوں کو کسی ان دیکھی مخلوق یا جنگلی جانور سے ڈرایا جاتا ہے۔ ایک مثال کینیا کی ایک لوری ہے جس میں لکڑ بگھے سے ڈرایا گیا ہے۔اس کے مطابق،

''جو بچہ نہیں سوئے گا، اسے لکڑ بگھا کھا جائے گا۔''

وجہ غالباً یہ ہے کہ کینیا کے دیہی علاقوں میں لکڑ بگھے زیادہ پائے جاتے ہیں ۔اسی طرح بابلی تہذیب کی قدیم ترین مانی جانے والی لوری میں بچوں کو دیوتا سے ڈرایا گیا ہے۔

اس زمانہ میں لوریوں میں خوف کا عنصر نمایاں تھا جس کا اثر بعض لوریوں میں اب بھی موجود ہے۔ممکن ہے کہ ماضی میں محبت اور تحفظ کے احساس سے بھرپور لوریاں تھیں لیکن وہ تاریخ کے اوراق میں گم ہوگئیں اور ماہرین کو صرف وہ لوری ملی جس میں خوف زدہ کرنے والے لفظ تھے۔لہٰذا ایک لوری کی بنیاد پر قیاس کرلیا گیا کہ گذشتہ ادوار کی لوریوں میں بچوں کو ڈرایا گیا ہے۔

موجودہ دور میں برطانیہ میں ایک معروف لوری ''راک اے بائے بے بی'' کے ایک بند کا مفہوم ہے،

''درخت کی شاخ پر بچہ جھول رہا ہے۔جب شاخ ٹوٹے گی تو جھولا گرے گا اور بچہ بھی شاخ اور جھولے سمیت گر جائے گا۔''

اس لوری میں بچہ کو ڈرایا گیا ہے۔

اگر آج سے صدیوں بعد آئندہ نسلیں اس لوری کو دریافت کرلیں اور وہ ہمارے بارے میں وہی قیاس کریں جو ہم نے بابلی تہذیب سے متعلق کیا ہے تو ایسا حقیقت کے برعکس ہوگا۔

☆

برصغیر پاک و ہند میں زیادہ تر لوریاں چاند ستاروں سے شروع ہوتی ہیں اور ماں کی محبت پر ختم ہوتی ہیں۔ مضمون کے شروع میں لکھی گئی لوری اس کی مثال ہے۔

برصغیر میں بچوں کو بھوت پریت سے ڈرانے کا رواج کم ہے، امن و محبت کی تعلیم اور دعا کے الفاظ ملتے ہیں۔بعض لوریاں ایسی ہیں جن میں الفاظ کے معنی متعین نہیں بس ایک دو حروف کو ردھم میں گایا جاتا ہے جیسے آللوللو۔

ایک خاتون کو اپنے بچہ کو ان الفاظ میں سلاتے سنا۔ معنی پوچھے تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ اپنے بڑوں کو یہی گاتے سنا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ گاتے وقت ذہن میں مفہوم ہوتا ہے کہ سوجا میرے بچہ سوجا۔

بچوں کی نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ،

''دنیا بھر میں کئی ایسی لوریاں ہیں جن کا لفظی مطلب نکالا نہیں جاسکتا۔زیادہ تر لوریوں میں محبت اور تحفظ کی باتیں ہوتی ہیں جب کہ کئی لوریوں میں ملک کی تاریخ کو دہرایا جاتا ہے۔''

ایک موسیقار نے لوریوں پر تحقیق کے لئے کچھ عرصہ کسی ہسپتال میں مختلف ممالک کی خواتین سے لوریاں سیکھیں اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ طرز معاشرت میں فرق کے باوجود مختلف اقوام کی لوریوں میں مماثلت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ،

’’ آپ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں ، مائیں ایک جیسی دھنیں استعمال کرتی ہیں اور ایک ہی طریقہ سے اپنے بچوں کو لوریاں گا کر سناتی ہیں۔ اکثر لوریاں صرف چند الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں جنہیں بار بار دہرایا جاتا ہے۔‘‘

بچہ کے حواس دنیا میں آنے سے پہلے ماں کے پیٹ میں بیدار ہو جاتے ہیں ۔ وہ سنتا ہے اور جن کیفیات سے ماں گزرتی ہے انہیں محسوس کرتا ہے۔

ماہرین اطفال کا کہنا ہے کہ،

’’ماں کی آواز پل کی مانند ہے جو رحم مادر میں بچہ کو بیرونی دنیا سے جوڑتی ہے۔ بچہ دوسری آوازیں بھی سن سکتا ہے لیکن ماں کے جسم کا حصہ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ماں کی آواز سے مانوس ہوتا ہے۔‘‘

ہمارے گھروں میں اکثر مائیں بچہ کو سلانے کے لئے

اللہ اللہ اللہ ھو

لا الٰہ الا ھو

کا ترنم میں ورد کرتی ہیں۔ ترنم میں یہ الفاظ سن کر بچہ رو رہا ہو تو خاموش ہو جاتا ہے اور خاموش ہو تو نیند کی وادی میں کھو جاتا ہے۔ تجربہ ہے کہ میرا بچہ ایک سال کا تھا تو میں اسے سلاتے ہوئے اللہ ھو کا ورد کرتی تھی۔ وہ ساکن ہو جاتا اور تھوڑی دیر بعد ھو ـــــ وووو کی آواز نکالتا۔ اور نیند کے فرشتے اسے آغوش میں لے لیتے۔

لوری ابتدائی تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ ہے یعنی پہلے بچہ کو ’’سننے والا بناؤ‘‘۔ بات سننے کی عادت سے طبیعت میں برداشت اور تحمل پیدا ہوتا ہے اور سمجھ بوجھ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ یہ لوری کے ذریعے ممکن ہے۔ معروف نعت جو لوری کے طور پر بھی پڑھی جاتی ہے، اس میں تربیت کا قانون ہے۔

حسبی ربی جل اللہ

ما فی قلبی غیر اللہ

نور محمد صلی اللہ

لا الٰہ الا اللہ

ان الفاظ میں وحدانیت، اللہ رسول سے محبت اور سیدھے راستہ پر چلنے کا اظہار ہے۔ جامعیت ہے اور اختصار بھی۔ الفاظ میں چاشنی اور زبان کی ندرت ہے اور دل پر پڑنے والی ضرب بھی!

کلام کو سن کر بچہ کے شعور میں اسلام کی بنیادی تعلیمات نقش ہو جاتی ہیں۔ گھر کا ماحول اللہ رسول کی تعلیمات کے مطابق ہو تو الفاظ کی تکرار سے لفظوں میں مخفی اسرار کھلتے ہیں۔

بچہ جب شیر خواری کے زمانہ سے اسکول کے اوائلی سالوں تک اماں اور نانی دادی کے لبوں سے یہ لوری سنتا ہے تو الفاظ میں تاثیر طبیعت کا حصہ بن جاتی ہے۔

بچوں کا ذہن صاف تختی ہے جس پر لکھی گئی عبارت اندر باہر دیکھنے کے لئے آئینہ ہے۔ بچپن سے ذہن میں راسخ ہو جائے کہ مافی قلبی غیر اللہ، اور اسی کے

مطابق تربیت ہوتو بچے صاحب یقین ہوتے ہیں۔

★

تحقیق کے مطابق بچوں میں تال اور لے کو سمجھنے کی خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ تال سے ہم آہنگ اور یک سو ہوجاتے ہیں۔ ماں اگر لوری نہ بھی گائے اور بچہ سے دھیمے لہجہ میں پیار سے بات کرے تو بچہ پُرجوش انداز میں ہاتھوں کو حرکت دیتا ہے اور اپنی زبان میں ردعمل ظاہر کرتا ہے۔

بچپن کے نقوش کا اثر تاعمر رہتا ہے۔ لوری کے بولوں میں اخلاقی تربیت کا عنصر ضروری ہے جس کا درس ماں دودھ پینے کے وقت سے بچوں کو دیتی ہے۔ اس طرح بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت ہوتی ہے۔

پنجاب میں گائی جانے والی ایک لوری پڑھئے۔

دن چڑھیا بھاگیں بھریا
ساڈا نبیؐ مکے وچ وڑیا
اونہیں وڑدیاں کلمہ پڑھیا
پڑھو لا الٰہ الا اللہ
محمدؐ پاک رسول اللہ
اللہ اللہ کیا کرو
خالی دم ناں بھریا کرو
کلمہ نبیؐ دا پڑھیا کرو
پڑھو لا الٰہ الا اللہ
محمدؐ پاک رسول اللہ

★

پشتو میں بچوں کو سلاتے ہوئے جو الفاظ لوری کی صورت میں گائے جاتے ہیں وہ ''اللہ ھو'' ہے۔ اللہ کا نام لے کر بچوں کو سلانا پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی لوریوں میں ہے اور یہ نیک عمل شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں علاقائی حالات کا اثر بھی لوریوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ماں ترنم کے ساتھ خاندان کی بہادری کے قصے سناتی ہے تاکہ بچہ کے اندر قومیت کے جذبات متحرک ہوں۔

پشتو کی ایک لوری کا ترجمہ پیش ہے،

''تیری ماں تنہا ہے، تیرا والد گھر پر نہیں، میری ماں ہے نہ میری بہن، جنگل سے ایندھن بھی لاتی ہوں اور گھر کا کام بھی کرتی ہوں، سوجا میرے لال سوجا۔''

★

دل چسپ بات یہ ہے کہ لوری صرف نوع آدم تک محدود نہیں۔ 2008ء میں تھائی لینڈ سے تصاویر کے ساتھ خبر سامنے آئی کہ ہاتھیوں کی نگہبان ایک خاتون کی لوری سن کر پالتو ہاتھی معصوم بچہ کی طرح سوجاتا ہے۔

لیک شائکرت نامی خاتون جب میٹھی آواز میں گنگناتی ہے تو ہاتھی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوجاتی ہیں۔ وہ سونے سے پہلے سونڈ سے خاتون کو قریب کرکے گلے لگاتا ہے اور سو جاتا ہے۔ اس دوران خاتون مسلسل دھیمی آواز میں لوری گاتی رہتی ہے۔

خبر کو پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر حیوانات کی دنیا میں دوسرا بڑا جانور ہاتھی لوری سن کے سوتا ہے تو کیا معلوم

باقی جانور بھی اپنے بچوں کولوری گا کر سلاتے ہوں۔

چڑیا کی چوں چوں ہمیں سمجھ میں نہیں آتی لیکن چڑیا کے بچہ کے لئے اگر یہ آواز اللّٰہ ھو ہو تو کیا اسے سن کر وہ شعور سے ماوراحواس میں داخل نہیں ہوگا—؟

☪

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے لوری کا مستقبل معدوم نظر آتا ہے۔موبائل فون، انٹرنیٹ، ٹی وی کے بے دریغ استعمال سے ماؤں کی توجہ بچوں کی تربیت پر کم ہے۔ بچہ کے ہاتھ میں موبائل دے کر اسے وقتی طور پر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

رات کو دیر تک ٹی وی دیکھا جاتا ہے اور گاڑی میں سفر کرتے ہوئے گانے سنے جاتے ہیں۔ایسے میں لوری کے بولوں کی جگہ اب نوجوان نسل کے ذہنوں پر بے ہنگم موسیقی کے اثرات غالب ہیں جس نے بچہ کی اخلاقی نشوونما کو متاثر کیا ہے اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

یاد رکھئے ! الفاظ کی بہت اہمیت ہے۔ ہر لفظ کہنے والے کے ذہن کے مفہوم کی تصویر ہے۔ بچہ جس کی بات سنتا ہے، اس کے ذہن کو قبول کرتا ہے۔ ماں باپ اور گھر کے دیگر افراد بچوں کی تربیت کی اہمیت کو سمجھیں اور دل چسپی لیں۔

تربیت کے بنیادی سال ابتدائی دس برس ہیں،اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر بعد میں بچہ ہاتھ نہیں آتا اور نتائج بھیانک ہوتے ہیں۔

اسلاف کی اچھی قدروں کے ذریعے اپنی اور بچہ کی تربیت کیجئے۔ بچوں کو لوری سنائیں اور خیال رکھیں کہ ان میں اللّٰہ رسولؐ سے محبت اور اچھے اخلاق کا ذکر ہو۔

لوری سنانے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب زمین پر پہلی بار ماں نے بچہ کو سلایا۔ اس وقت سے یہ آواز نسل درنسل منتقل ہورہی ہے۔ جب تک نظام کائنات قائم ہے، کسی نہ کسی گھر سے لوری کی آواز آتی رہے گی لیکن اس بات کا خیال رہے کہ لوری میں تربیت اور تربیت میں اخلاقیات کا عنصر نمایاں ہو۔

☪

مرغی نے خواب دیکھا

یہ کہانی میں نے اپنے بڑوں سے سنی ہے، امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

خوب صورت، سیاہ اور صحت مند مرغی کے پر دھوپ میں چمکتے تو دیکھنے والوں کو پروں میں کئی رنگ نظر آتے تھے۔ صحت اچھی ہونے کی وجہ سے وہ نہ صرف دوسری مرغیوں سے زیادہ انڈے دیتی تھی بلکہ سمجھ دار اور بہادر بھی تھی۔ مرغوں کے ساتھ مرغیاں بھی اس کے رنگ روپ سے متاثر تھیں۔

سیاہ مرغی کی آن بان شہزادیوں جیسی تھی۔ دوسری مرغیوں سے میل جول کم تھا، دڑبے میں الگ تھلگ اینٹوں پر چڑھ کر سوتی تھی جیسے اینٹ نہیں — ملکہ کا تخت ہو۔

ایک روز عصر کے وقت تمام مرغیاں دڑبے سے باہر دانہ چگ رہی تھیں، سورج غروب ہو رہا تھا۔ سیاہ مرغی نے کھانا کھایا اور پھر سورج غروب ہونے سے پہلے دڑبے میں جا کر اینٹوں کے تخت پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ نہ جانے کب نیند آ گئی۔

رات کے تیسرے پہر اس نے خواب دیکھا۔ خواب میں کسی نے پکارا،

''جلدی کرو، اجمیر شریف جاؤ ورنہ دنیا اجڑ جائے گی۔''

آواز سنتے ہی مرغی کی آنکھ کھل گئی۔ قریب موجود مرغے بانگ دے رہے تھے۔ مرغی خواب میں آواز سن کر گھبرائی ہوئی تھی۔ دل اس باغ میں تھا جہاں دڑبا بنا ہوا تھا اور وہ دیگر مرغیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ دنیا اجڑ جائے گی تو میں کہاں رہوں گی، بچے بڑے کہاں جائیں گے اور دوسری مرغیوں کا کیا ہوگا۔

سوچ بچار کے بعد خواب میں سننے والی آواز پر عمل کرنے کا ارادہ کیا کہ اجمیر جاؤں گی — راستہ طویل ہے، طرح طرح کی مصیبتیں آئیں گی لیکن میں نے مشکلات کا سامنا کر لیا اور اجمیر پہنچ گئی تو میری قربانی سے دنیا بچ جائے گی۔

تھوڑی دور چلی تھی کہ بلی ملی۔

مرغی بولی، بہن بلی، السلام علیکم۔ اجمیر شریف

جارہی ہوں، میرے لئے دعا کرنا۔

بلی بولی، کیا ہوا خیریت۔ وہ بھی اکیلے؟

مرغی نے کہا، کٹ کٹ کٹاک، خواب میں دیکھا ہے کہ اگر میں اجمیر نہ پہنچی تو دنیا اجڑ جائے گی۔

بلی نے قہقہہ لگایا اور بولی، تم خوابوں پر یقین رکھتی ہو؟ بھلا تمہارے اجمیر پہنچنے یا نہ پہنچنے سے دنیا کا کیا کام—؟

مرغی کو بلی کا لہجہ اچھا نہیں لگا، کٹ کٹ کٹاک کرتے ہوئے بولی، بی بلی! خواب دیکھا ہے اور مجھے خواب میں چھیچھڑے نظر نہیں آتے۔ چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی اور بلی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

سیاہ مرغی کو راستہ میں ضعیف مرغا ملا۔

مرغی بولی: باباجی! آداب!

ضعیف مرغے نے جواب دیا، ککڑوں کوں تسلیمات۔ جیتی رہو، جگ جگ جیو بیٹی۔ صبح صبح کہاں جارہی ہو؟ مرغی نے کہا، ضروری کام سے اجمیر شریف جارہی ہوں۔ اگر وہاں نہیں پہنچی تو دنیا اجڑ جائے گی۔

ضعیف مرغے کی پیشانی پر بل آگئے اور پریشان لہجہ میں پوچھا— ککڑوں کوککڑوں کو، تجھے کس نے یہ بات کہہ دی —؟ مرغی جھٹ پٹ بولی، بابا! میں نے خواب میں سنا— خود سنا ہے۔

مرغا بولا: یا اللہ رحم۔ بیٹی اکیلی مت جاؤ، میں ساتھ چلتا ہوں۔

دونوں تالاب کے پاس سے گزرے تو بطخ ملی۔

بطخ نے دونوں کو دیکھا تو سلام کیا— قیں قیں قیں، سلام باباجی، سلام بہن۔ یہ اتنی تیزی میں آپ دونوں کہاں جارہے ہیں۔ سب خیر ہے ناں؟

بیٹا! اجمیر شریف جارہا ہوں، دیر ہوگئی تو ساری دنیا اجڑ جائے گی۔

ایسا کس نے کہا؟ بطخ نے حیرانی سے پوچھا۔

ضعیف مرغا بولا، ہماری مرغی بیٹی نے۔

بطخ نے مرغی کی طرف دیکھا تو مرغی بولی، کٹ کٹ کٹاک! میں نے خواب دیکھا ہے۔ مجھے خواب میں بتایا گیا ہے کہ جلدی اجمیر پہنچ ورنہ دنیا ختم ہوجائے گی۔

بطخ فوراً پانی سے باہر آئی اور پروں کو جھاڑتے ہوئے بولی، ایسا ہے تو میں بھی چلتی ہوں۔

تھوڑی دور چلے تھے کہ تیتر ملا۔ تینوں کو ساتھ

دیکھا تو سلام کرنے کے بعد ماجرا پوچھا۔

بطخ بولی، قیں قیں قیں۔ ہم اجمیر شریف جا رہے ہیں۔ منزل دور ہے اور جلدی پہنچنا ہے، نہیں تو دنیا اجڑ جائے گی۔

تیتر نے پوچھا، ارے رے رے، بی بطخ دھیرج دھیرج — ایسی خبر کس نے دے دی؟

بطخ بولی، قیں قیں میاں مرغے نے۔

بڑے میاں! آپ دور کی کوڑی کہاں سے لے آئے؟ انہوں نے خاموش رہتے ہوئے سیاہ مرغی کی طرف اشارہ کیا۔ تیتر نے سوالیہ نظروں سے مرغی کو دیکھا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

مرغی بولی — کٹ کٹ کٹاک، میں نے خواب میں سنا ہے۔ دعا کرنا کہ ہمیں کام یابی ہو اور وقت پر اجمیر شریف پہنچ جائیں۔

اوہ! یہ بات ہے، تیتر بولا۔ خواب میں راہ نمائی ملی ہے تو میں بھی ساتھ چلوں گا۔

سب خوش ہوئے کہ ایک سے دو اور دو سے چار ہو گئے۔ پُرعزم انداز میں اجمیر کی طرف جانے والی سڑک پر چل دیے۔

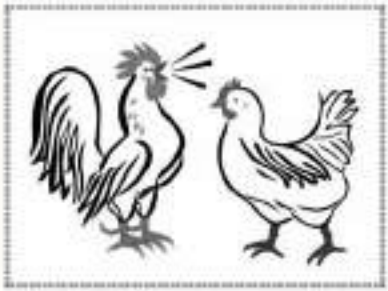

شام ڈھل رہی تھی۔ چلتے چلتے تھکن سے چور ہوئے۔ ایک سرائے میں چند گھنٹے آرام کیا۔ پھر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ سب تازہ دم تھے۔

چلتے چلتے کوہ و دمن سے گزرے۔ ہرے بھرے میدان اور کھیت کھلیان دیکھے۔ چشمہ سے پانی پیا، قریب لومڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ چار سپاہیوں کو تیز تیز قدموں سے کہیں جاتے ہوئے دیکھا تو بولی، لگتا ہے کہ کوئی مشن سر کرنا ہے۔ خیریت تو ہے؟

تیتر بولا، کیا بتاؤں، انتہائی ضروری کام سے اجمیر جا رہے ہیں۔ دیر کر دی تو دنیا اجڑ جائے گی۔

لومڑی ہنسی چھپاتے ہوئے بولی، ہائے! اللہ نہ کرے۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

بی بطخ نے۔

بی بطخ! کس کی دنیا اجڑ جائے گی؟

بطخ نے معصومیت سے بتایا، مرغے میاں سے پوچھو۔ لومڑی نے مرغے کی طرف دیکھا۔ وہ بولا، مرغی بیٹی نے خبر دی اور ہم چل دیے۔

اور بی مرغی تمہیں کس نے کہا؟

مرغی بولی، مجھے کون کہتا، میں نے تو خواب میں سنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سستی کی وجہ سے دنیا تباہ ہو جائے۔ ہم چلتے ہیں۔ اللہ حافظ۔

لومڑی بولی، ارے رکو، ایسی بھی کیا جلدی۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔ میرے گھر چلو، منہ ہاتھ دھوؤ، کھانا کھاؤ، آرام کرو اور صبح سورج نکلنے سے پہلے سفر دوبارہ شروع کرنا۔ ایک رات میں کیا دنیا اجڑے گی۔ صبح میں بھی ساتھ چلوں گی۔ مجھے دیکھ کر تم لوگوں پر کوئی حملہ نہیں کرے گا۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ لومڑی کا مشورہ پسند آیا۔

سردی کا موسم تھا۔ چاروں تھکے ماندے لومڑی کے گھر میں داخل ہوئے تو جان میں جان آئی۔ لومڑی نے بہت خیال رکھا، کھانے کے لئے بادام، کشمش، پستے دیئے۔ سیاہ رات اور اوپر سے سرد ہواؤں کا جھکڑ چلا تو سب نے شکر ادا کیا کہ اچھا ہے لومڑی کی بات مان لی ورنہ سردی میں ٹھٹھر جاتے۔

لومڑی ہنستے ہوئے بولی، یہ تو میرا فرض ہے۔

انگیٹھی میں آگ جلائی۔ لومڑی کا گھر گرم ہوا اور سردی میں کمی آئی تو سب جمائیاں لینے لگے۔ مرغے اور مرغی کو زمین پر سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اڑ کر مکان کے تختہ پر بیٹھ گئے اور سب سو گئے۔ خراٹوں کی آواز سے کان پڑی آواز سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

سب سو چکے تھے — سوائے لومڑی کے۔

رات کا ایک پہر گزرا تو لومڑی نے انگڑائی لی اور تیتر جو ان سب میں چھوٹا تھا، دبوچ کر مار دیا اور کوئلوں پر رکھ کر اس کا تکہ بنایا۔ تیتر کے پر، گوشت اور چربی جلی تو بدبو سے مرغی کی آنکھ کھلی، وہ پھدک کر مزید اونچے تختہ پر جا بیٹھی اور بولی، کیسی بدبو ہے؟ گڑبڑ ہے، کچھ گڑبڑ ہے۔

لومڑی نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا، شش — خاموش! سب اٹھ جائیں گے۔ گھر لکڑیوں کے دھوئیں سے بھر گیا ہے۔ چونچ مت کھولنا ورنہ دھواں پیٹ میں بھر جائے گا۔

مرغی نے یقین کر لیا اور سو گئی۔ تیتر کو کھانے کے بعد بھی لومڑی کا پیٹ نہیں بھرا تو اس بار تیزی سے بطخ کو دبوچا۔ بطخ بے چاری نے بڑا زور لگایا لیکن لومڑی نے اس کی چونچ دبائے رکھی اور گھر سے باہر لے گئی — کام تمام کیا تو اندر لا کر اسے بھی انگاروں پر بھوننے لگی۔ مرغی کی نیند پہلے ہی کچی ہو گئی تھی۔ پھدک کر مزید اونچے تختہ پر جا بیٹھی اور بولی، گڑبڑ

ہے ـــ کچھ گڑبڑ ہے۔

لومڑی نے خاموش کروایا کہ لکڑیوں میں گیلی لکڑی آ گئی ہے، اسی کا دھواں ہے۔ ابھی باہر لے جاتی ہوں۔ یہ کہہ کر بطخ کو انگاروں سے اتارا اور باہر لے جا کر دعوت اڑائی۔

سورج نکل رہا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی۔ مرغی کی آنکھ کھلی تو مکان میں پھیلی بو سونگھ کر گھبرا گئی اور چھت کی دیوار پر بیٹھ کر ماحول کا جائزہ لیا۔

کیا دیکھا کہ مرغا آرام سے سویا ہوا ہے لیکن تیتر اور بطخ غائب ہیں اور لومڑی ایک کونے میں پیر پسارے لیٹی ہوئی ہے۔ مرغی نے بھانپ لیا۔

آنکھیں بند کر کے فرار کی راہ سوچی۔

ذہن میں جھماکا ہوا اور اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ مکان کی چھت پر چھوٹا روشن دان تھا، اس کے قریب لکڑی پر پھدک کر بیٹھی، سر باہر نکال کر دیکھا اور بولی، ککڑوں کوں، ککڑوں کوں ـــ وہ دیکھو، کتنی خوب صورت، موٹی تازی، سفید بطخیں ہیں ـــ ایک کے بعد ایک ـــ لمبی قطار ہے۔

لومڑی کے کان کھڑے ہو گئے، منہ میں پانی بھر آیا۔ کھڑی ہو گئی اور بولی، صبح بخیر مرغی بہن۔ ذرا میں منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤں، پھر تمہارے لئے ناشتا تیار کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلی۔

لومڑی کے نکلتے ہی مرغی نے مرغے کو آواز دی، کڑکڑکڑکڑ، غضب ہو گیا ہے، اٹھو، جلدی اٹھو۔

مرغے نے گھبرا کر آنکھ کھولی اور کہا، کیا ہوا، دنیا اجڑ گئی کیا؟

مرغی نے کہا، بے خبر پڑے رہے تو ایسا ہی ہو گا۔ اور فرفر فرفر ایک سانس میں ساری کہانی مرغے کو سنا دی۔ کہنے لگی، ساتھیوں کا معلوم نہیں، یقیناً لومڑی انہیں کھا چکی ہے۔ میں نے روشن دان کے باہر بطخ کے پر دیکھے ہیں۔

مرغے نے سنا تو بولا، بھاگو!

دونوں اڑے اور روشن دان سے باہر نکل کر مکان کی چھت پر آئے۔ دیکھا لومڑی غصہ میں بھری ہوئی مکان کی طرف آ رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا، مرغا مرغی نے ادھر دیکھا نہ ادھر ـــ اڑتے اڑتے، گرتے پڑتے اجمیر کی طرف بھاگے۔

عصر کے قریب اجمیر شریف پہنچے اور دونوں نے شکر ادا کیا ورنہ بطخ اور تیتر کی طرح ان کی دنیا بھی اجڑ جاتی۔

لڑکی نے گائے اٹھائی اور چھت پر لے آئی

کسی گاؤں میں ایک لڑکی کو گائے پالنے کا شوق تھا۔ ابا نے گائے کا انتظام کر دیا۔ وہ اس کا خیال رکھتی، صبح اٹھ کر دودھ دوہتی اور چارا پانی رکھتی۔ گائے بھی اس سے مانوس تھی۔

لڑکی نیک سیرت تھی۔ پڑوس میں رہنے والی خاتون بیٹے کا رشتہ اس لڑکی سے طے کرنا چاہتی تھیں۔ بیٹا شہر میں رہتا تھا اور تعلیم یافتہ تھا۔ ماں نے بیٹے سے خواہش ظاہر کی تو وہ بولا کہ لڑکی دیکھے بغیر شادی نہیں کروں گا۔

چھٹیاں لے کر گاؤں آیا۔ رات میں گھر کی چھت پر لیٹا ہوا تھا کہ پڑوس کی چھت پر ایک سایہ نظر آیا جس کے ہاتھوں میں بھاری بھرکم کوئی شے تھی۔ حیران ہوا کہ دبلا پتلا سایہ اپنے سے کئی گنا بڑے وجود کو کیسے اٹھا سکتا ہے۔

چاند کی مدھم روشنی میں سایہ واضح ہوا تو لڑکے کا سانس حلق میں رہ گیا اور ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ پڑوس میں رہنے والی لڑکی تھی جس سے اماں اس کا بیاہ کرانا چاہتی تھیں۔

لڑکا لڑکی کو نہیں، لڑکی کے ہاتھوں میں گائے کو دیکھ کر سکتہ کی کیفیت میں تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ دھان پان سی لڑکی نے گائے کو ہاتھوں میں اٹھایا ہوا ہے اور وہ گائے کو گود میں اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر صحن سے چھت پر آئی ہے۔ لڑکے نے آنکھیں ملیں لیکن منظر تبدیل نہیں ہوا۔

لڑکا دیوار کے قریب آیا، لڑکی نے گائے کو ایک طرف باندھا اور پیار سے ہاتھ پھیر کر نیچے آ گئی۔

لڑکے کو پوری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی اس نے شادی سے انکار کر دیا۔

اماں! یہ لڑکی ہے یا بلا—؟ گائے ایسے اٹھا کر چھت پر لائی تھی جیسے بکری کا بچہ ہو۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ بھلا وزنی گائے کے سامنے میری کیا اوقات۔ ایک پھونک سے اڑ جاؤں گا۔

ماں ہنسی نہ روک سکی، والد نے قہقہہ لگایا جب کہ لڑکے کے اوسان خطا تھے۔ ناراض نظروں سے اماں ابا کو دیکھا کہ انہوں نے کیا سوچ کر گائے کو گود

میں اٹھانے والی لڑکی کا انتخاب کیا۔

اماں نے کہا، جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں۔ اسے جانور پالنے کا شوق ہے۔ رہا چھت پر اٹھا کر لے جانے کا معاملہ تو رات میں جنگلی جانور اس طرف نکل آتے ہیں، ان سے بچاؤ کے لئے یہ روز رات کو گائے چھت پر باندھ دیتی ہے۔

اماں گاؤں میں ہر گھر میں گائے بھینس ہیں لیکن میں نے کسی مرد یا پہلوان کو تن تنہا گائے اٹھاتے نہیں دیکھا۔

ابا بولے، پتر! گائے کو اٹھانے کا تعلق وزن سے نہیں، سکت سے ہے۔ آدمی گائے کو اس لئے نہیں اٹھا سکتا کہ اس میں سکت نہیں۔ سکت پیدا ہو جائے تو اٹھا لے گا۔

لڑکا بولا، اس دھان پان سی لڑکی میں سکت ہے؟

انہوں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا، بالکل ہے پتر، اسی لئے تو وہ گائے کو اٹھا لیتی ہے۔ پتر! بندہ وزن جسم کی طاقت سے نہیں، ذہن کی طاقت سے اٹھاتا ہے۔

لڑکا اماں ابا کے ارادوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

کیا مطلب ابا۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟

ابا نے کہا، بچی پہلے روز سے گائے کا خیال رکھ رہی ہے جب گائے پیدا ہوئی اور بچھیا تھی (بچو! گائے کے بچہ کو بچھیا یا بچھڑا کہتے ہیں) یہ اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ گائے بڑی ہوتی گئی لیکن لڑکی کے ذہن میں نہیں آیا کہ میں گائے کو نہیں اٹھا سکتی۔ وہ گائے کو اب بھی بچھیا سمجھتی ہے۔ بچھیا کے وزن میں اضافہ ہوا تو ساتھ ساتھ لڑکی کی سکت بھی بڑھتی گئی۔ اب اس کا ذہن گائے کے وزن کو اٹھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ کل میں نے گائے کو اٹھا لیا تھا، آج بھی اٹھا لوں گی۔

لڑکے نے یہ سنا تو خاموش ہو گیا۔

پتر! مصیبت سامنے آئے تو ہٹے کٹے لوگ ہمت ہار جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے کام کر لیتے ہیں کہ دنیا حیران ہو جاتی ہے۔ موٹا، دبلا، لمبا، چوڑا، چھوٹا ہونا طاقت معلوم کرنے کا پیمانہ نہیں۔ اصل قابلیت ''سکت'' ہے۔ بے خوف شخص میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور منزل مل جاتی ہے۔ اگر تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔

لڑکا فوراً بولا، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔

اماں ابا ہنس پڑے۔ اس بار ہنسنے والوں میں بیٹا

بھی شامل تھا۔ اگلے روز اماں بیٹے کا رشتہ مانگنے گئیں ۔ چھان بین کے بعد بات طے ہوگئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

پیارے بچو! سکت ، طاقت ، زور یا قوت سب صلاحیت کے مختلف نام ہیں ۔ ایک دن کا بچہ خود سے کروٹ نہیں لے سکتا ، بیٹھ نہیں سکتا ، چند مہینوں کے بعد اماں سہارا دے کر بٹھاتی ہیں۔آس پاس تکیہ رکھتی ہیں کہ بچہ لڑھک نہ جائے ۔ دادی ، نانی ، بہن بھائی سب اسے چلنے پھرنے اور بٹھانے کی مشق کراتے ہیں۔مشق سے بچہ میں سکت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ خود سے اٹھنا ، بیٹھنا ، چلنا اور دوڑنا شروع کرتا ہے ۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دوسروں کو چلنا سکھاتا ہے۔

اسکول میں ایک سے دس تک جماعتیں ہوتی ہیں۔مقصد دسویں جماعت تک پہنچنا ہے ۔ بقیہ نو جماعتیں سکت بڑھانے کے لئے ہیں۔

ہونہار بچو! دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں ۔آپ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کی مشق کیجئے ،سکت بڑھے گی اور صلاحیت بیدار ہوجائے گی۔

سمجھدار بچہ

ذکر ہے ایک ننھی تتلی کا جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ اڑتے ہوئے ہرے بھرے باغ میں رنگ برنگ پھولوں پر آ کر بیٹھی اور پھولوں کا میٹھا رس چوسنے لگی ۔ اچانک پیچھے سے بچہ آیا اور تتلی کو پکڑ لیا۔ تتلی کی سہیلیاں فوراً اڑ گئیں ۔ بچہ تتلی کو گھر لے گیا اور بوتل میں بند کر دیا۔ ابو نے دیکھا تو بیٹے سے کہا کہ اسے آزاد کر دو ۔ بچہ نے کہا کہ یہ مجھے بہت اچھی لگی ہے میں اسے پالوں گا ۔ ابو نے پوچھا ، تم اسے کس طرح پال سکتے ہو ــــ؟ یہ تو ڈالی ڈالی گھومتی ہے اور پھولوں کا رس چوستی ہے۔ اگر تمہیں یہ اچھی لگی ہے تو اسے آزاد کر دو تا کہ یہ خوش رہ سکے ۔ بچہ نے بات مان لی اور آزاد کر دیا۔ تتلی ساری باتیں سن رہی تھی ۔ اسے فرماں بردار بچہ بہت اچھا لگا ۔ بچہ نے تتلی سے کہا کہ میں اپنے باغ میں نئے نئے پھولوں کے پودے لگاؤں گا ۔ تم روز مجھ سے ملنے آنا اور پھولوں سے رس پینا۔ تتلی اس کی دوست بن گئی اور روز اپنی سہیلیوں کے ساتھ بچہ کے باغ میں آتی اور خوب خوش ہوتی ۔ (شائستہ زبیر ۔ جماعت : اول، عظیمی پبلک ہائر سیکنڈری اسکول)

خواب تعبیر اور مشورہ

شہنشاہ ہفت اقلیم

عون محمد، گلبرگ۔ رات کے وقت ایک درگاہ کے لان میں کھڑا ہوں، پیلے بلب خوب روشن ہیں۔ دالان کی دیوار کے ساتھ سرخ گلاب اور گیندے کے پھولوں سے بھری دو تھالیاں ہیں۔ کوئی شخص موجود نہیں۔ اندر سے آواز آئی، یہ حضور بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی درگاہ ہے۔ میں نے خوشی خوشی مزار کے اندر جانے کی کوشش کی لیکن وہ بند ہے۔ کھڑکی سے جھانکا تو قبر انور پر بنے نقش و نگار رات کی وجہ سے ہلکے نظر آئے۔ چھت پر سفید پنکھا تھا۔ میں جہاں پہلے کھڑا تھا وہیں واپس آ گیا۔

تعبیر: غریبوں کو کھانا کھلا کر ثواب شہنشاہ ہفت اقلیم حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کو پہنچائیں۔

ببر شیر

ثروت افتخار، کراچی۔ خواب میں دیکھا کہ ابو اور بھائی ببر شیر گھر میں لا کر باورچی خانہ میں کولر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔

تعبیر: آئی اسپیشلسٹ سے آنکھیں ٹیسٹ کرائیں۔ خواب ظاہر کرتا ہے کہ نظر کا معائنہ ہونا چاہئے۔

سمندر سے گہرا

نام شائع نہ کریں ــــ میرپور خاص۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ ایک بزرگ میرے لئے دودھ لائے ہیں جو میز پر ہے۔ گھر میں بزرگ کی موجودگی سے بہت خوشی ہوئی اور سوچا کہ فلاں شخص نے بتایا نہیں اور بزرگ کو میرے گھر لے آئے۔

پھر دیکھا کہ بڑی بہن کے ساتھ جا رہی ہوں، وہاں گندگی دیکھ کر میں بہن کی گود میں چڑھ گئی کہ اتنے گندے راستہ پر نہیں جاؤں گی۔

منظر بدلا اور کسی گھر میں اکیلی داخل ہوئی۔ جن صاحب سے ملنا تھا ان کی بیگم صاحبہ موجود تھیں۔ انتظار گاہ میں باہر والے دروازہ کے بیچ میں کھڑے ہو کر دیکھا تو حد نگاہ تک سمندر تھا، جہاں جہاں نگاہ گئی سمندر آسمان سے ملا نظر آیا، وہ عمارت سمندر کے بیچ میں ہے جس کی دیواروں سے سمندر کی لہریں ٹکرا رہی ہیں۔ احساس ہوا کہ جس جگہ کھڑی ہوں وہ سمندر کا سب سے گہرا حصہ ہے۔ پھر وہ صاحب نظر آئے جن سے ملنے گئی ہوں، وہ تو اللہ کے دوست ہیں۔

تعبیر: خواب میں بتایا گیا ہے کہ آدمی سمندر سے

بھی زیادہ گہرا ہے۔ سمندر میں اونچی عمارت دیکھنا ظاہر کرتا ہے خواب دیکھنے والی خاتون کے اندر روحانی علوم سیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اپنے مرشد کریم کے تجویز کردہ اسباق پر پابندی سے عمل کریں۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یاحیی یاقیوم پڑھتی رہیں۔ کوشش کریں کہ پانچ وقت نماز کی پابندی کریں اور چھوٹی سورتوں کا ترجمہ یاد کر کے نماز میں پڑھتے وقت ترجمہ ذہن میں دہرائیں۔ پاکیزگی کا بطور خاص خیال رکھیں۔ خواب مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے کامیابی عطا فرمائے، آمین۔

صدف جمال، کراچی۔ **تعبیر:** صدف جمال بیٹی، خواب اور خیال کا دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خواب میں دیکھے ہوئے حالات میں حقیقت کتنی ہے۔ زیادہ تر خواب جو یاد رہتے ہیں وہ ماحول کے زیر اثر جو باتیں خوش آئند ہوتی ہیں یا جو ناگوار ہوتی ہیں وہ شکلیں بدل کر نظر آجاتی ہیں۔ رویائے صادقہ اور رویائے کاذبہ خواب کی دو قسمیں ہیں۔ جب شعور پر بے خبری طاری ہوتی ہے آدمی سو جاتا ہے۔

سونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا ہے اس کو شعوری اعتبار سے صحیح سمجھا جاتا ہے لیکن خواب کے حواس میں اسپیس کے سمٹنے اور پھیلنے کا عمل دخل بیداری کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ خیالات کی رفتار زیادہ یا اتنی کم ہو جاتی ہے کہ آدمی کوئی بات سوچتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ نیند کیا ہے — سمجھنے کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیند اور بیداری میں فرق یہ ہے کہ ہم بیداری میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اسپیس کے تابع ہو کر دیکھتے ہیں لیکن خواب میں جن حالات و واقعات سے گزرتے ہیں بظاہر خواب کے اور بیداری کے حواس میں فرق نظر نہیں آتا لیکن فرق ہے۔ بیداری میں جو دیکھتے ہیں اس میں اسپیس کی پابندی ہے جیسے دن اور رات۔ رات میں آدمی سو جاتا ہے تو شعور مغلوب ہو جاتا ہے لیکن — شعور مغلوب ہونے کے باوجود شعوری کیفیات بدستور کام کرتی رہتی ہیں — آدمی جو کچھ بیداری میں کرتا ہے وہ سونے کی حالت میں بھی کرتا ہے۔ آدمی حلوہ کھاتا ہے لیکن ذہنی طور پر وہ سونے کی کیفیت میں ہے۔

حلوہ کا ذائقہ، خوش بو، رغبت — وہ عوامل جو بیداری میں مظہر بنتے ہیں وہی خواب میں حلوہ کھانے سے ہوتے ہیں۔ آدمی نیند میں حلوہ یا بریانی کھاتا ہے۔ خواب کی دنیا سے بیداری کی دنیا میں مظہر بنتا ہے۔ اسے یاد ہے کہ میں نے حلوہ کھایا ہے۔ کہاں کھایا کس طرح کھایا یہ جزئیات بھی یاد ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ کھانے کی خوش بو بھی بیدار ہونے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر دوسرے کسی صاحب کو ہاتھ سنگھائیں تو انہیں لازماً حلوہ کی خوش بو آتی ہے جب کہ گوشت پوست کے مادی جسم کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس قسم کے خواب آدمی ہر روز دیکھتا ہے لیکن اگر شعور

پر بے خبری غالب ہے تو خواب یاد نہیں رہتے ۔ قارئین غور کیجئے گا جو خواب میں ہم نے کھانا کھایا اس میں ہمارا مادی ہاتھ استعمال ہوا، مادی ناک استعمال ہوئی، مادی زبان نے ذائقہ محسوس کیا۔ اگر کیا ہے؟

ایک لاکھ کا صدقہ

ثانیہ صدیق۔ بھائی کے لئے لڑکی دیکھنے گئے تو ان کے باورچی خانہ میں بہت سارے لوگ ہیں۔ چھوٹا بھائی لڑکی دیکھنے کے لئے اندر آیا، لڑکی کے والد باہر ہیں۔ پھر دیکھا کہ کہیں جارہی ہوں تو وہ لڑکی یہ کہہ کر ساتھ چلتی ہے کہ میں آپ کے گھر جارہی ہوں۔ میں نے کہا، تمہارے ابو کو پتہ چل گیا تو؟ اس نے کہا، بہانہ کرلوں گی۔ اب میں امی کے گھر باورچی خانہ میں ہوں جہاں ایک لاکھ کا صدقہ کا جانور ذبح ہوا ہے اور بہت گوشت ہے۔

تعبیر: خواب کے اجزا ظاہر کرتے ہیں صفائی کم ہونے کی وجہ سے گھر میں خوشی کے بجائے اداسی کا عنصر زیادہ ہے۔ گوشت والا خواب بیماری کی علامت ہے، زیادہ امکان اندرونی بیماری کا ہے۔ آپ کے لئے مشورہ ہے کہ گھر میں صفائی اور کھلی ہوا کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے۔ خواب کے کردار میں اس بات کو بھی ظاہر کیا گیا ہے کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط نہیں کی جاتی۔ برتن دھونے میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ پلیٹ کے اندر گہرائی میں میل رہ جاتا ہے۔ غذا میں بطور خاص پرہیز کرنا ضروری ہے۔

الذین یومنون بالغیب

دعا اقبال، سرجانی۔ گاڑی میں کچھ مسئلہ ہوگیا تو شوہر نے کہا آپ گھر چلی جائیں میں مرمت کروا کے آتا ہوں۔ اس علاقہ میں ہڑتال ہے۔ جب آگے گئی تو بڑا شامیانہ دیکھا جس میں روحانی ورکشاپ ہورہی ہے۔ کمرے کے اندر تمام سہیلیاں موجود ہیں۔ باجی نے ناراضی کا اظہار کیا کہ رجسٹریشن کیوں نہیں کرائی۔ میں ہنس کر چپ ہوگئی۔ ایک سہیلی نے تفصیل سے سمجھایا جو سمجھ میں آگیا۔ باہر شامیانہ میں خواتین اسی نکتہ پر مذاکرہ کررہی تھیں جس کا نتیجہ تھا الذین یومنون بالغیب۔ یہ آیت ذہن میں گونجتی رہی اور آنکھ کھلنے پر بھی ذہن میں گونج رہی تھی۔

تعبیر: الحمدللہ آپ کے اندر قرآن سمجھنے کی فہم موجود ہے۔ ہم جب غور سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو قرآن کریم کے الفاظ ایسے الفاظ ہیں جو اردو میں بولے جاتے ہیں۔ سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیات پڑھئے، الحمد، سب تعریف۔ رب العالمین، اس کے لئے ہے جو عالمین کا رب ہے اور اللہ کی ذات رحمٰن اور رحیم ہے۔ غور وفکر کے ساتھ قرآن کریم پڑھئے اور تلاش کیجئے کہ ابتدائی آیات میں وہ الفاظ بیان ہوئے ہیں جو ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین، سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا رب ہے اور رحمٰن رحیم ہے۔ اللہ رب ہے عالمین کا۔ الرحمٰن الرحیم مالک

یوم الدین ۔ مالک یوم الدین اردو زبان میں عام طور سے بولا جاتا ہے۔قرآن کریم کو پڑھا جائے کافی حد تک قرآن کے الفاظ ہم روزانہ گفتگو میں بولتے ہیں ۔ جو الفاظ عربی کے ہیں اردو زبان میں بولے جاتے ہیں ۔ جب اس طرح قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو ترجمہ آسان ہو جاتا ہے ۔کتنا المیہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ پڑھتے ہیں اور اکثر الفاظ اردو زبان میں بولے بھی جاتے ہیں — اگر اللہ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ قرآن کریم کو غور سے پڑھا جائے کافی حد تک مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔اہم بات یہ ہے کہ جب آپ کو عربی زبان کے الفاظ یاد ہیں اور ان کا پڑھنا اور معنی اردو زبان میں موجود ہیں تو تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے معنی ومفہوم سمجھ میں آجاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،'' اور ہم نے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا، ہے کوئی سمجھنے والا۔''

دوسری طرز میں سوچا جائے تو یہ سوچ ظاہر ہوتی ہے آدمی کی ذہنی صلاحیت اتنی ہے کہ مادری زبان کے علاوہ وہ دوسری زبانیں بھی سیکھتا ہے۔ رب کائنات کا ارشاد ہے،''ہم نے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا، ہے کوئی سمجھنے والا۔''

اضافی باتیں

اع، امریکہ ۔شہنشاہ ہفت اقلیم حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے سامنے بیٹھی کچھ مانگ رہی ہوں۔ آپ شفقت بھری نظر سے مسکرا کے فرماتے ہیں، سامنے ہماری مرقد ہے اس کے قریب سے گزرو تو مراد پوری ہو جائے گی۔اس جگہ سے گزر کے آئی تو دو افراد کو باتیں کرتے سنا کہ تدفین سے پہلے باباؒ کا دیدار ہونا چاہئے تھا۔سوچتی ہوں کہ ابھی تو میں ان سے بات کر رہی تھی کیا اس کے بعد انتقال ہوا؟ پھر خیال آیا کہ میری ملاقات حضرت بابا تاج الدینؒ کی روح سے ہوئی تھی۔ دوسرے صاحب کہتے ہیں، باباؒ کا آخری دیدار میٹنگ کے دوران ہوا تھا۔ پھر مجھ سے کہتے ہیں کہ مرقد کے پاس جگہ کم ہونے کی وجہ سے انتظامیہ حاضرین کو اٹھا دیتی ہے اس وجہ سے مزار کو بڑی جگہ منتقل کر دیا ہے، آپ وہاں سے بھی گزریں۔منظر بدلا اور میں کینیڈا مراقبہ ہال میں کھانے کی پلیٹیں دائرہ میں لگا رہی ہوں۔ جب کھانا پلیٹوں میں ڈالتی ہوں تو ایک صاحبہ کہتی ہیں کہ ان پلیٹوں میں دوسرا کھانا رکھنا تھا۔

تعبیر: خواب الحمدللہ مبارک ہے۔البتہ خواب میں ذہن جگہ جگہ منتشر نظر آتا ہے۔حضرت نانا تاج الدینؒ کی بابرکت زیارت نہایت خوش بختی ہے۔ذہن میں انتشار ہونے کی وجہ سے اضافی باتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ آپ ایصال ثواب کیجئے۔ درود شریف کے ساتھ چاروں قل پڑھ کر ثواب پہنچایئے اور لوگوں کو کھانا کھلایئے۔

بیٹے کو چاقو مارا

نام شائع نہ کریں، مڈل ایسٹ۔شوہر نے بیٹے کے پیٹ اور سینہ پر چاقو سے دو تین وار کئے۔ بچہ رو رہا ہے

اور میں تڑپ رہی ہوں، شوہر بھی روتے ہوئے کہتے ہیں ہمارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر کہتے ہیں دوسرا کہاں ہے اور اسے بھی مارتے ہیں (ہمارا ایک ہی بیٹا ہے)۔ بیٹے کو شلوار قمیص پہناتی ہوں کہ زخم نظر نہ آئیں۔ میں رو رہی ہوں کہ یہ مر جائے گا۔ وہ بھی مدہوشوں کی طرح چل رہا ہے۔ پھر منظر بدلا اور دیکھا کہ امی کے ساتھ سڑک پر کھڑی ہوں۔ تار پر پرندے دیکھ کر رو پڑتی ہوں کہ بیٹا پرندے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ امی سے کہتی ہوں، یہ کون لوگ ہیں؟ وہ کہتی ہیں، صحیح کہہ رہی ہو۔ آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں، کہہ کر میں رونے لگتی ہوں۔ منظر بدلا، کزن اپنے گھر میں بیٹھی برتن دھو رہی ہے لیکن وہاں نلکا الٹا لگا ہوا ہے یعنی جہاں سے کھولتے ہیں وہاں سے پانی آتا ہے اس کے باوجود وہ آرام سے برتن دھو رہی ہیں۔ مجھ سے کہتی ہیں، یہاں پر رات کو اکثر دو چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ کسی جن کے بچے ہیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ انہیں کوئی ڈر نہیں۔ آنکھ کھلی تو بیٹے کے بارے میں خواب سوچ کر رونا آ گیا۔

تعبیر: گھر میں بیزاری، الجھن اور ناگوار باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ''جو لوگ غصہ کھاتے ہیں (یعنی غصہ نہیں کرتے) اور اللہ کے لئے معاف کرتے ہیں، اللہ ایسے احسان کرنے والے

ماہنامہ قلندر شعور اگست 2019ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:..... والدہ صاحبہ کا نام:.....

پورا پتہ:.....

ازدواجی حیثیت:.....وزن (تقریباً):.....آنکھوں کا رنگ.....

نیند کیسی آتی ہے:.....بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):..... تاریخ پیدائش:.....

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.....فون نمبر.....

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات :.....

.....

بندوں سے محبت کرتا ہے۔'' دوسری اہم بات یہ ہوسکتی ہے کہ کھانوں میں بطور خاص ناقص اشیا استعمال ہوتی ہیں۔خصوصاً مسالے گھر میں پیس کر استعمال کریں۔

سائرہ سعید قریشی، اسلام آباد۔**تعبیر:** رات کو سونے سے پہلے صاف ستھرا ہو کر اچھا لباس زیب تن کریں۔ گھر میں ایک طرف کونے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر دو نفل ادا کریں اور اول آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ سورہ اخلاص 41 مرتبہ پڑھیں۔ یہ عمل کرنے سے پہلے سورہ اخلاص کا ترجمہ یاد کرلیں۔سورۃ اخلاص پڑھنے کے بعد سجدہ کریں اور بطفیل سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ آپ کے مقصد میں کامیابی ہو۔سجدہ سے اٹھ کر بات کئے بغیر سو جائیں۔ یہ عمل 90 دن کرنا ہے۔ ہر مسلمان مرد عورت پر نماز فرض ہے۔نماز کی پابندی کریں، چلتے پھرتے وضو بے وضو یا حیی یا قیوم کا ورد کریں۔

سندس انعم، وہاڑی۔**تعبیر:** جو خواب آپ نے لکھا ہے اس میں ادھر ادھر کے خیالات کا ہجوم ہے۔

مریم بی بی، کراچی۔**تعبیر۔** آپ نے جو خواب دیکھا ہے وہ ماحول کی تصویر ہے۔ بتانا یہ ہے صفائی نہیں ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جو ہر چلتے پھرتے آدمی کو نظر آتا ہے۔

اللہ کے دوست

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے نہ غم۔یَاوَلِیُّ کا ترجمہ حمایتی اور دوست ہے۔یَاوَلِیُّ کا ورد رکھنے والا عامل لوگوں کی نظروں میں دوستی کی علامت بن جاتا ہے اور اس کے اندر ایسے اوصاف حمیدہ پیدا ہو جاتے ہیں کہ مخلوق اسے عزیز رکھتی ہے۔جس بندہ کو اللہ کی مخلوق عزیز رکھتی ہے اور جو اللہ کے بندوں کے کام آتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے بندوں سے محبت کرتے ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں وہ اللہ کا دوست ہوتا ہے۔

عدم تحفظ کا احساس

بلوا ہو جائے، فساد اور خون خرابے کے حالات پیدا ہو جائیں۔غنڈہ گردی ہو یا عدم تحفظ کے احساس کا غلبہ ہو اور جنگ کی تباہ کاریاں ہوں، ان سب سے محفوظ رہنے کے لئے یَامُقَدِّمُ 125000 (سوا لاکھ) مرتبہ اجتماعی طور پر پڑھا جائے۔انشاء اللہ ہر تکلیف اور شر سے حفاظت ہوگی۔

signals on a television but due to the problem of tuning the TV shows snowy noise on screen. This noise is the waves within which real information is enclosed.

Scientists believe that the hissing sound has to do with the origin of this Universe. But, at the same time, experts wonder when the dimensions, magnitude and quality of light of all the stars is not same, how the hissing sound of Big Bang is simultaneously present everywhere.

Why is there difference between pieces of information gathered from different kinds of light.

What is the connection among visible rays, x-rays, laser rays, ultra violet rays and magnetic rays? What are their qualities? These and other such questions have yet to be answered.

While explaining change in the results of observation with the change in the composition of light, Qalandar Baba Aulia (RA) says, "Let's suppose we are seeing an object, if the light between that object and us is removed, that object will go out of the bounds of our consciousness or awareness". This example leads us to a conclusion that light is conscious and vice and versa. The experts of spiritualism directly use their knowledge (and change them as they wish) but science uses several tools and equipment for this purpose.

While explaining the theory of Chromolucis, Khwaja Shams al-Din Azeemi says that this Universe can be viewed in two different ways. One, merely viewing. Two, finding out the formulas which brought this Universe into being. Viewing Universe or viewing manifestation of Universe falls within the circle of consciousness. Viewing inside of the Universe is viewing subconscious of this Universe. Human subconscious knows it clearly as to what is the shape, movement and hidden sensitivities of every grain of this Universe. This knowledge doesn't transfer to consciousness because one cannot read one's subconscious. If we acquire the ability of understanding, the study of every grain of this Universe will become easy. Khwaja Sahib further says that man is made of two layers. One layer is made of material body whereas the other one is made of light. The material body receives information from the body of light. This information is accepted with certain limitations. What is material body? The body made of mud and the one that becomes mud (after death) is material body. And what is mud? Divine scriptures clearly define mud. Everything on earth and skies is made of *Noor* or light and this light is dividing in specific quantities in each creature. As these specific quantities grow up, child grows in age. When lights start decreasing, an individual ages. The body ultimately becomes particles of earth again. These particles are nothing but light. Wood and rubber are called non-conductor of electricity. But, in fact, these two have electricity which has greater absorption power. As per divine teachings, no object in this world is a non-conductor. (The End)

rate. Whatever the truth, Wendy Freedman's estimate has rendered the theory regarding the age of Universe as deduced from Big Bang theory even more doubtful since the age of the old and permanent stars was estimated at 8-12 billions whereas the age of stars surrounding them is estimated at 15 billion. The photographs taken by Hubble have discovered new research perspectives.

The physicists and astronomers agree that the Universal spread we are viewing is but a small part of the Universe. We could observe only those stars which are within our range and at the same time which emit lights. But it is not necessary that all the stars could be viewed even if we use the enhanced vision provided by Hubble. Our eyes could recognize specific quantities of light. According to the experts of spiritual knowledge, the movement of lights appear in varied shapes but it is not necessary that we view them.

This can be explained through an example. We view our facial expression in a photo. These expressions are captured by the reflection of light on photographic plate. It may be kept in mind that there are other ways to make photos including x-rays, red rays, radio waves etc. Compared to ordinary camera, x-rays could make photos of inner organs.

Science says that radio waves view anybody as dielectric material .For instance, water in our body is a conductor of electricity but fat or any tumours are semi-conductors. In Kirlian Camera objects are placed in light magnetic field. The electro-magnetic rays emitted from the objects hit the rays of camera and produce an image which is recorded on photographic record. This way a halo is seen around the object. It needs to be understood that photos thus acquired are different angles of the same object which are fully and partially different from each other. These photos underscore the angles which are otherwise hidden from our eyes.

For instance, if seen with eyes sun appears to be a silent bright circle. But photos acquired through x-rays shows intense activities on the surface of sun. Countless nuclear processes are continuing on the surface of sun whose temperature is extremely high. The dark space between bight stars is not dark or empty. The laser rays show that there are stars in that space too whose rays lose energy as they spread out in the space. Photographs taken from Hubble show several constellations in galactic systems.

Surprisingly, a hissing sound was heard when Universal system was studied through microwave. This sound was heard in 1968 when satellite dishes were installed to receive signals from artificial satellites. It was deduced that certain waves are travelling in space and what information is hidden within these waves is not known. But their presence indicates presence of some system. The problem is how to derive information from these waves. It is like receiving

Fig 2

were recorded and data thus collected was disseminated among various teams of scientists to draw conclusions.

The scientists then realized that lights twinkling in the sky lose many of their qualities before entering the earth's atmosphere. The cover of earth would bring about changes in these lights. It is for this reason that these lights appear wavering and their origins i.e. stars are seen away from their actual place. The solution of this problem was found in the use of laser rays aligned to stars. This way, telescope remains focused on targeted star.

In order to reduce influence of atmospheric pollution, a telescope named Hubble was invented whose mouth was about two feet wide. This telescope was installed in space. This telescope set human quest about space on a new track. The telescope took pollution free photos of two thousand galaxies. This was a great achievement.

Wendy Freedman, an astronomer at Carnegie Institute studied these photos and indicated constellation of stars at a permanent location in addition to several non-permanent groups of stars whose structure, rays and qualities were different.

Freedman used the technique of red rays and estimated the age of this Universe at between 8-12 billion years. This estimate was totally different from earlier estimates. In the world of stars, time is calculated by hydrogen clocks. The quantity of hydrogen on any star and consequent brightness, determines its life and age. Presence of huge quantity of hydrogen indicates that the star is new born. Contrarily, stars with less quantities of hydrogen, die very soon. The conclusion of study showed that the life of permanent stars was less than non-permanent stars. This surprised scientists. People wondered how was it possible that the life of a child is more than the life of its mother when the mother is still alive.

This means that the age of origin of Universe should, in any case, be more than sub-Universe. Otherwise, estimates about the age of the origin will not be accu-

that the burning of hydrogen caused emission of light. This way, the quantity of hydrogen helps determine age of galactic system. The scientists began to determine the age of Universe using Doppler shift. This procedure can be understood by this example. If a car completes its 60 km journey by the speed of 30 km/hour, the car will reach its destination in two hours. In this manner, when the current location of the galactic system was determined, it was surmised that the spread of Universe began 15-20 billion years ago. However, this is not certain.

Questions for experts:

1. How can this be accepted that Universe began 20 billion years ago when known history is limited to 5000 years?
2. We spend half of our life awake (or conscious) and half in sleep (or subconscious). The grip of time and space loosens when we are asleep. One of the dimensions is consciousness. If this is removed, what would be the position of subconscious?

Senses operational in night overshadow or overcome the senses functional during day in a manner that these could not be measured.

Note: Think about these questions and write your replies. We will publish them in this magazine.

Science has not yet been able to provide satisfactory replies to following questions:

- How old is this world?
- How was man created?
- How did this world begin?
- How does evolution take place in the world?

These questions have occupied the attention of most of the philosophers, scientists and physicists through centuries. At the end of the 20^{th} century, the experts believed that soon they would be able to provide equations explaining spread of Universe and its structures. But all this is still a far cry.

The development of science has, indeed, enhanced the depth of scientific observation. Yet, it has also created doubts about prevalent theories and with it problems of research also increased. The use of electricity brightened nights with lights generated by electricity. This electric light obstructs lights emitted by other stars from reaching earth. Observation of lights coming from celestial bodies, therefore, gradually became difficult.

In order to avoid this problem, the scientists shifted their observatories to remote, dark and uninhabited areas. With improvement in digital technologies, telescopes and other equipment, observations became deep and, to an extent, clear. The scielntists focused on galactic system which had compatibility with their theories regarding the origin of Universe. They called this system Super Nova (Fig 2). Computers equipped with artificial intelligence began to monitor it on regular basis. Its various angles

The Universe is Light

How can this be accepted that Universe began 20 billion years ago when known history is limited to 5000 years?

With progress in mechanical engineering, equipment to measure celestial phenomena also improved. Edward Hubble closely observed clouds of Nebula and the results of his observations were surprising. One of the constellation of stars at the Milky Way appeared to be a galaxy itself. It became known that this galactic system which was named as Andromeda was the closest neighbour of Earth. The Milky Way appears to be a strip whereas Andromeda is like spiral galaxy. This neighbouring galaxy is around 25,00,000 Light Years away from us. This time around, yet another scientist Doppler presented a new theory regarding waves emitted from moving objects. He observed that when a honking vehicle comes close to us, the pitch or rhythm of the horn increases. The basic reason of this is that our ears receive more waves per second when the vehicle approaches us. When the car goes away, reception of waves per second decreases. Similarly, when light from remote galaxies is approaching us, its colour transforms from light blue to dark blue.

Contrary to it, light going away shows colours from light red to dark red highlighting decrease in the intensity of light. Kindly note that the space around the objects is seen in blue shadows of different sizes.

The observation of red beam spread of galactic system has added new piece in the repository of knowledge. All the experts agree that Galactic System is travelling towards an unknown direction. Moreover, this Universe is expanding all the time. Einstein and his contemporaries believed that this Universe was forever. But the new theory indicated evolution of Universe. This theory clashed with the views of Einstein and his contemporaries. The new photos of telescopes shocked the scientists. They had no explanations for the questions raised on previous theories.

They focused on the question as to if this Universe was expanding then what are the drivers of this expansion. What forces and system are promoting this expansion. The questions everyone wanted to address were as follows:

* What is the point of origin of this Universe?
* Where is this expansive material Universe emerging?
* What is the position of Big Bang in the point of origin?

The physicists believed that the Universe began with high temperature which emitted bright light. This gave birth to hydrogen which spread phenomenally and cooled down swiftly to merge with each other. Soon this merged hydrogen emerged as dust and smoke and ultimately became galaxies or constellations of stars. Experts inform

to thy Lord, prostrate thyself and bow with those who bow." (Quran, 3:42-43)

Prophet Jesus (PBUH) is one of the most highly respected and holy messengers, whose arrival was prophesied by many prophets before him.

"And he said, The Lord came from Sinai, and rose up from Seir unto them; he shined forth from mount Paran."

(Deuteronomy, 33:2)

"Behold, I send my messenger before thy face, which shall prepare thy way before thee. The voice of one crying in the wilderness, Prepare ye the way of the Lord, make his paths straight." (Mark, 1:2-3)

The Gospel of Matthew

"Now when Jesus was born in Bethlehem of Judaea in the days of Herod the king, behold, there came wise men from the east to Jerusalem, Saying, Where is he that is born King of the Jews?"

(Matthew, 2:1-2)

"When Herod the king had heard these things, he was troubled, and all Jerusalem with him. And when he had gathered all the chief priests and scribes of the people together, he demanded of them where Christ should be born. And they said unto him, In Bethlehem of Judaea: for thus it is written by the prophet, and thou Bethlehem, in the land of Juda, art not the least among the princes of Juda: for out of thee shall come a Governor, that shall rule my people Israel." (Matthew, 2:3-6)

The Quran has also mentioned the account of Prophet Zechariah (PBUH) and Prophet John (PBUH) as setting the foundations for the Prophet Jesus (PBUH). Prophet John (PBUH) is the proclaimer of the glad tidings of Prophet Jesus (PBUH).

"And the angels called to him as he stood praying in the sanctuary: God giveth thee glad tidings of (a son whose name is) John, (who cometh) to confirm a word from God, lordly, chaste, a Prophet of the righteous."

(Quran, 3:39)

(Episode 1)

A king asked a famous artist to draw a beautiful picture of a door to the heart. The artist spent days and nights to produce a state-of-the-art drawing. Once it was ready, he presented it in the king's court. Everyone who saw it congratulated him for coming up with such an artistic peace, but the king remained quiet, and seemed busy in his thoughts. After a while, he asked, "I don't see any latch to open the door. Why is there not one? How would one open it?"

The artist replied, "Your Majesty! The heart's door does not open from the outside, rather, it opens from the inside only. That is why I have drawn no handle."

her a goodly growth; and made Zechariah her guardian."

(Quran, 3:35-37)

When Mary (PBUH) grew up, it became an issue as to whom should be entrusted with the responsibilities of her care. Everyone wished to take care of her. As Prophet Zechariah (PBUH) was the uncle of the honourable Mary (PBUH), and a respected rabbi and prophet, he was therefore delegated as being responsible for her. Prophet Zechariah (PBUH) dedicated a room near the synagogue for the revered Mary (PBUH) so that she may remain busy during the day hours in prayers, and he would take her home as the night would descend. Mary (PBUH) remained busy with prayers and fulfilled her responsibilities with regards to the temple dutifully and diligently.

Provisions From Sources Beyond One's Imaginations

Prophet Zechariah (PBUH) occasionally visited Mary (PBUH) to look after her needs and to see if she was doing well. He found it quite unusual to see unseasonal fresh fruits in her room.

One day he asked her, "Mary, from where do you get these unseasonal fruits?"

She replied, "This is a blessing from God. He provides provisions in abundance to whomever He Wills."

Prophet Zechariah (PBUH) realised that Mary (PBUH) had a high status in the court of God. At the same time, the event of unseasonal fresh fruits triggered a desire in his heart for a child and so he thought, "God, Who has blessed Mary (PBUH) with unseasonal fresh fruits can certainly give me a son, irrespective of the fact that I am old and my wife is sterile."

Prophet Zechariah (PBUH) wholeheartedly made a prayer to God, and it was accepted by Him.

"…and made Zechariah her guardian. Whenever Zechariah went into the sanctuary where she was, he found that she had food. He said: O Mary! Whence cometh unto thee this (food)? She answered: It is from God. God giveth without stint to whom He will. Then Zechariah prayed unto his Lord and said: My Lord! Bestow upon me of Thy bounty goodly offspring. Lo! Thou art the Hearer of Prayer."

(Quran, 3:37-38)

A Woman of High Status

The revered Mary (PBUH) lived a virtuous life along with her pious and righteous activities. Prophet Zechariah (PBUH) was very impressed with her piety and devotion towards worship. God raised her status even further and sent glad tidings through the angels.

"And when the angels said: O Mary! Lo! God hath chosen thee and made thee pure, and hath preferred thee above (all) the women of creation. O Mary! Be obedient

Prophet Jesus (PBUH)

Prophet Zechariah (PBUH) occasionally visited Mary (PBUH) to look after her needs and to see if she was doing well. He found it quite unusual to see unseasonal fresh fruits in her room.

A pious and a righteous man named Imran lived in the land of Palestine. Due to his piety and devotion, he was responsible to lead prayers at the temple. His wife, Hannah, was also a pious and righteous lady. They both were well-known and liked by the children of Israel due to their uprightness.

Imran's lineage sourced back to Prophet Solomon (PBUH), and his wife Hannah, the daughter of Faqooz ibn Qabeel was a descendent of Prophet David (PBUH). They did not have any children but both husband and wife had a strong desire to have children.

One day, Hannah was walking in her veranda, where she saw a bird feeding its chick. When she saw this, her heart brimmed with maternal feelings and she raised her hands to pray to God, "O' my beloved God! Bless me with children who may please our eyes and be a source of peace for our hearts."

The earnest prayer that emerged right from her heart was accepted. After some days, Hannah felt that she was pregnant. She was immensely happy and to show her gratitude, she vowed to devote her child in the service of the Al-Aqsa mosque.

Imran-The Husband of Hannah

Imran passed away before the birth of their child. Hannah gave birth to a girl, but she did not love her any less than a boy. She was worried however, about her inability to fulfil the pledge. God put her heart at ease by giving glad tidings, "We have accepted your girl, and your family will be honourable and blessed because of her."

Hannah named her daughter Mary. In Classical Syriac language, it translates to 'servant'.

"Lo! God preferred Adam and Noah and the Family of Abraham and the Family of Imran above (all His) creatures. They were descendants one of another. God is Hearer, Knower." (Quran, 3:33-34)

"(Remember) when the wife of Imran said: My Lord I have vowed unto Thee that which is in my belly as a consecrated (offering). Accept it from me. Lo! Thou, only Thou, art the Hearer, the Knower! And when she was delivered, she said: My Lord! Lo! I am delivered of a female. God knew best of what she was delivered. The male is not as the female; and Lo! I have named her Mary, and Lo! I crave Thy protection for her and for her offspring from Satan the outcast. And her Lord accepted her with full acceptance and vouchsafed to

Busy Bees

Hello, I am a honey bee. My name is Rosie and I am a teacher at the 'Honey Making School' where I teach little bees how to make honey. I have two groups in my class. One group's leader is Poly, and the other groups' leader is called Sunny. Each group has six bees overall.

One day, I told the little bees that honeycomb is made of our wax. It has hexagonal compartments with six corners which are used for storing honey and pollen. The next day, I taught them how to make honey, the process of pollination, and how to protect the larvae and our house.

One of the students, Poly, asked me, "Ma'am, how would we know which nectar is good for us and which is not?" I said, "God has blessed us with special senses. He inspires us to choose only the useful nectar. However, juices from marigold, rose, lavender, strawberries, raspberries, peaches, apples, and more, all taste quite good."

I then sent them away to practice what I had taught them. Poly's group was very smart. They chose good nectar from flowers of use. But when Sunny's group went to the garden, they became confused. This is because they were not paying attention during class. Poly and her teammates helped Sunny's team and said, "Concentrate on your inner voice and you will receive inspiration from God."

When they returned to their comb, their bags of nectar were quality checked by the body guards at the entrance. After examining the nectar, they placed it into the cells. Sunny's group was very lazy and did not flap their wings to dry the water in the nectar, and instead covered the nectar filled cells with wax immediately. However, Poly's group followed the instructions they were given. They flapped their wings until the water had dried out, and then covered it with their wax.

When I went to inspect who had performed well, I found that the honey made by Poly's group was ready and fresh, whereas Sunny's group's honey did not taste good at all. I advised them to be more careful next time.

One day, a badger attacked our honeycomb. I commanded, "Attack! Use your Stings! We are in trouble." All of us attacked him, but the honey badger raised his long fur coat and ran away with our honey. We did not chase him, for he was hungry. Nevertheless, we did not lose heart, and started making honey once again.

(Iffat Mahmood - Class 1)

herbs in my refrigerator. I thought about so much life could literally shoot up around me if I allowed it to sprout. All I needed was soil, water, sunlight and a little love. I decided to embark on this quest with a handful of seeds and through watching them grow, I wished to enjoy the phases of creation that God takes them through. In order to execute my plan, I chose three seeds that were easily available in my kitchen jars. The first were coriander seeds, the second, mustard seeds, and the third were chilli seeds. Little did I know that these handful of seeds would give me so much to learn over two weeks, and so many insights to carry with me in my contemplation.

I brought out pots of soil and planted the seeds, all pots kept on an equal platform and watered evenly. I placed them next to my long glass windows where they received indirect sunlight with at an even intensity. Despite their equal treatment however, the mustard seeds sprouted first. In fact, life oozed out of them the day after I had planted them. After about a period of five days, I saw the saplings of coriander seeds gradually rise above the soil. Some of the seedlings still wore the shell of the seed over their shoots like a pretty little hat. But as the mustard and coriander seeds kept growing, the chilli seeds seemed to be disinterested in sprouting altogether. When I was about to give up on them two weeks later, I woke up one morning to find myself staring at a lush green patch of chilli saplings.

As I sat before these three pots, I began to wonder in amazement at the lessons these young saplings had to offer me. I visualised these pots of soil as our planet earth and the diverse seeds as us humans, planted by God Almighty. Are we all not like the seeds? My mind drew a comparison between the sprouting of the seeds to the process of mankind experiencing their consciousness. We too, like the seeds, take different amounts of time to process, assimilate, act and birth into self-awareness. Is it not true that we compare those who are slow thinkers to those who are quick, and those who have experienced and not experienced spiritual observations, without realising that every seed is ingrained with a specific timeline to rise over the soil and come into a state of cognisance? The deep interaction with plants left me respecting and loving them more than ever.

Silent I think they stand,
The plants and trees around me.
Without realising it's I,
Who knows not how to hear them!
When the web of individuality,
Dissolves into the cosmic oneness,
I will find you in me dear plants.
Let us celebrate that blessed day,
When I birth into my own light,
Let us remember to come together in an embrace
And converse to our hearts content.

❁ ❁ ❁

be as long as 5-6 feet. The flowers have both male and female organs present in them. The pistil is the female organ, and as it is not functional in male trees, they are fruitless. However, the tree had an amazing capability where it could temporarily change its gender at the height of temperature during peak summer times, and become a hermaphrodite with a functional pistil to allow pollination and the production of fruit. Another interesting part was that if one chopped the head of the male papaya tree off, it could be turned into a female tree! The most important lesson I learnt from my mother through the harvesting of fruits however, was that we should never pluck 100% of the fruit a tree produces. We should take about 60-75% for our use and leave a quarter or more for the birds as food.

Peace Lovers

Research has been carried out where a team applied a polygraph machine on many plants, and they found that when a plant witnessed the murder of another plant, it could pick out the murderer from among a line of suspects by increasing its electrical activity when said murderer stood close to it. The experiments showed that plants had a strong aversion to interspecies violence, and are affected if an egg is cracked before them or if a live shrimp is thrown into boiling water. This study was published in the International Journal of Parapsychology, in the year 1968.

Precision and Sensitivity

Some plants such as the sundew are extremely sensitive to touch, and can detect a strand of hair weighing less than one microgram (one millionth of a gram) and respond to it. What's more intriguing is the fact that they can specifically determine what is touching them. When raindrops fall, or any natural phenomenon of the wild occurs, they do not respond. The plants are able to analyse what is touching them and conclude their meaning and act. They use this response to make changes in their genetics, phenotype, and subsequent physical form. This makes their learning permanent and it is transferred to future plants in their coming generations.

Memory

To substantiate the power of plant memory, let us review an experiment conducted where a mimosa plant was dropped every 5 seconds, over 60 times. The plant usually folds its leaves when falling or if it suspects danger, but it stopped doing so after the numerous falls as it was able to memorise the fall, and its outcome. It understood that it did not have to curl its leaves as a defence mechanism as the fall would not harm it.

Gestation Period

One often hears about how lonely city life can get. In the wake of this largely prevalent phase of solitary life, I saw a ray of hope in the seeds stored in my kitchen jars and in the roots and

an entire forest can communicate with each other. The network has even earned the nickname, 'Wood Wide Web'.

Eavesdropping

To prove this phenomenon, a team of plant scientists grew pairs of tomato plants in pots and some of the plants were allowed to connect with each other through the matrix of mycorrhizae. Once the network was established, they sprayed the leaves of one plant with a fungus that causes disease. The plants were covered with airtight plastic bags to avoid them communicating above the ground. After about 65 hours, when the second plant was being sprayed with the disease-causing fungus, they realised that the second plant was not affected as much as the first was. It was apparent that the second plant had 'eavesdropped' on the first plant, and heard what had happened to it beforehand, thus preparing its defences in advance.

Survival Skills

I then remembered my visit to the 'Tree of Life' in the city of Manama, Bahrain. The tree stands alone in the middle of nowhere with no known source of water around it. How it has managed to survive for hundreds of years has been an enigma to people around the world. This lone tree was such a major source of inspiration to me that I travelled far distances to meet it along with a friend. As luck would have it, the popular tourist destination was absolutely empty on our arrival. After meeting the beautiful tree, I began to conduct some research on how the tree managed to survive in a dry desert, on the edge of a rocky mountain, and with no visible water resource. I had read that the root apex has been created to be sensitive and perceptive, making it act like both a sensory organ and a brain neuron. As an example, think of a rye plant that has more than 14 million rootlets that run up to a length of 622 kilometers if combined together. The root hairs that cover these rootlets make the combined length of about 11,000 kilometers. Every rootlet and root hair has an apex. From this we can see that this matrix of rootlets and root hairs can allow trees and plants to find water from unimaginably far distances.

Changing Gender at Will

My mother had an unending collection of plants of varying species. Some so rare that people would offer to buy them from her, to which she would threaten them with a stare and say, "Don't you dare touch my baby." It is true that you acquire your values from your parents. My love for plants and trees has come from watching my mother's love for them. She had what one refers to as a 'green thumb'. Whatever she touched sprouted, grew and produced flowers and fruits.

I remember her pointing out a papaya tree in our back yard and teaching me a very intriguing life lesson. Male papaya trees can be identified by the clusters of flowers that grow at the end of branching stalks. Some of the stalks can

The Enchanting Plant Kingdom

"...we should never pluck 100% of the fruit a tree produces. We should take about 60-75% for our use and leave a quarter or more for the birds as food."

I was absorbing the *Aaj Ki Baat* (Message of the Day) from January 2015, penned by the Spiritual Scholar and Sufi Master, Khwaja Shams al-Din Azeemi. It was a very compassionate account of how plants feel, communicate and emote as much as humans do. He had elaborated his points through many stories and quoted research material on how plants talk to us, feel, and are even affected by us.

SOS Signal

I recall an incident from the very morning I had read the article. I was all set to execute a few tasks that had piled up for the day, when my eyes met the money plant that was growing in my living room. It had grown so beautifully long and strong over the last few months that it instantly caught the eye of those who walked in its vicinity. The plant had created a mesmerizing effect by gently winding itself around the walls and ceiling of the room, but on closer inspection, it was clear that the leaves were beginning to dry out, and voice inside suggested that I examine the plant in more detail immediately. The calling was so strong that I put my laptop aside and untangled the long, winding stems to get a better look. To my utter dismay, I saw that the stem had snapped off from its root! Though it was being watered, it was not receiving nourishment anymore. I instantly repotted it and was able to prevent any further damage that could have been fatal for the poor plant. I hugged it in a warm embrace. The plant had communicated with me and had sent an SOS signal. It wanted me to assist it and I was so glad that I picked up on its signals before it was too late. This was a practical demonstration of what I had just learnt from my spiritual master.

Communication

As I began to read more on plants and their ability to communicate, I found that in recent times, many research papers have suggested that plants, trees in particular, can communicate with one another. This communication happens underground through the Mycorrhizal network. This network is formed by a cobweb-like growth of a certain type of fungi that grows around the roots of trees. The mass of thin threads that connects trees across hundreds of miles is called mycelium. These networks are so useful that they pass on all sorts of information between trees, like the availability of nutrients, and warnings of potential threats from insects, etc. Metaphorically, one could consider the Mycorrhizal network to be the Wi-Fi connection of trees through which even

wall and phased through the solid wall to go to the street. This wonderworking most likely happened unintentionally.

As his mind became completely absorbed in the divine light of God while solving people's matters, his body – being subservient to his mind – became free from gravity."

A man once said to Baba Taj al-Din (RA), "Huzoor, I would like to go to Ajmer."

Baba Sahib (RA) said, "Where are you going? Ajmer is here."

As he said this, he laid his hand on the hand of the man who requested. The man suddenly became oblivious of his surrounding and saw himself roaming in Ajmer Sharif. After a short while, Baba Sahib (RA) removed his hand and the person found himself back in the presence of Baba Sahib (RA). This happened because Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) produced an angle in the man's vision that was required to view Ajmer, and he visited it as if he was there.

On many occasions, Hazrat Baba Taj al-Din (RA) was seen at different places simultaneously. Once Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) asked about the wisdom behind it.

Baba Sahib (RA) replied, "An easy way to describe this phenomenon is through a photograph. In photography, first a negative is produced and later positives are made out of it. From a negative we can make not only one positive picture, but as many as we wish. More or less, the same is true for the soul. The soul is like a negative and the body of flesh is its positive. If one has a clean and powerful mind, they can display themselves, just like positive images, in several places simultaneously."

Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) used to listen to people's issues even during his last days when he had become so weak that he could not sit up easily. Sometimes, when the rush of people around him grew too thick, he would say aloud, "You may all leave. All of your issues are solved." Satisfied, people would leave and their problems would be solved, just as Baba Sahib (RA) said.

In this article, a few accounts, wonder workings, and their interpretations have been presented. The truth is, every word that left Baba Taj al-Din Nagpuri's (RA) mouth, requires explanation.

Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) advised people through signs and metaphors. His purpose was to help set them free from lust, so that they did not trouble others. Sometimes, he used a strict tone. Once someone asked him, "Why do you scold people ?" He replied, "No! I actually pray for them."

ready, it was placed in decorative pots. The servants carried everything and she presented it before Baba Taj al-Din (RA) who said, "This is of no use to me. Who could serve us such a meal?" The lady of Bhopal felt really ashamed.

A follower of Baba Taj al-Din Nagpuri (RA), Yousuf Hussain Khan, visited him. Baba Sahib (RA) told him, "Go! Half of *dewan* is awarded to you." During that time, there was only one such title in the state. No one understood what half of the *dewan* meant. After some time, the state was divided into two districts and two posts were created – *dewan* of the eastern districts and *dewan* of the western districts. Therefore, two *dewan* were setup and one post was awarded to Yousuf Hussain Khan.

Muhammad Abdul Aziz was in the army. He was a follower of Hazrat Baba Taj al-Din (RA) and used to recite *Naat* (a poetry in praise of Prophet Muhammad (PBUH)) before him quite often. One day, Baba Sahib (RA) asked him to bring a book. When he brought it, Baba Taj al-Din (RA) opened a page and put a small twig as a marker and said, "This is your abstinence." When Muhammad Abdul Aziz heard this, his life turned upside down. Everything appeared worthless to him. It occurred to him that he should avoid all worldly affairs. He planned to sit in isolation and leave everything behind. These thoughts were in his mind at all times. After a few days, Baba Taj al-Din (RA) asked for a book again and said, "40, 50, 60, 70 – understand what abstinence is." The next day, Baba Nagpuri (RA) spiritually explained to him that abstinence does not mean to abandon the world. Rather, it means to get rid of those thoughts that hinder one's progress in the path of God.

The grandson of Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA), Abdal-e-Haq Qalandar Baba Auliya (RA) said, "During the time when my father was a tool tax officer in Delhi, a wall of our home fell down due to the heavy downpour. The landlord did not agree to do the maintenance during the rainy season. Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) wrote a letter to my father and asked him to send Baba Taj al-Din's sister in law, and her daughter Saeeda, to Nagpur. At that time, Baba Taj al-Din (RA) was staying at Raja Raghu Rao's palace. Our stay was arranged in Satranjipura. Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) came to us every day, or sometimes every second day on his horse carriage and would spend hours with us. The local people visited him quite often. Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) would spend great energy in solving their problems to the point that his senses would become numb. One day, instead of going through the door, he unintentionally went to his horse carriage through the

life that he not only complied to the order of Baba Sahib (RA), but he also remained in service to him for the rest of his life.

A man visited Baba Taj al-Din (RA) and requested for a prayer that he may attain spiritual blessings and progression. Baba Nagpuri (RA) said, "Kill a dog and bring it here. We both will eat it." Baba Jee (RA) was directing the man's attention towards the saying of Prophet Muhammad (PBUH) that says, "This world is a corpse and those who desire it are dogs." In other words, he was telling the man to enter into the world of the unseen by diverting his attention from the glitter of material world, and focusing on the treasure within one's self.

A disciple called Maulana Yousuf met a dervish, and they gradually became friends. The dervish knew the formula to turn any metal into gold, which he shared with Maulana. Maulana thought that if Baba Taj al-Din (RA) permitted him to do so, it would give him the opportunity to meet his ends easily. He came to Baba Sahib (RA) who said to him, "Do you want to eat filth?" When Maulana heard this, he became cautious and avoided getting into such practices.

On one occasion, Baba Taj al-Din (RA) was walking around the shrine of Hazrat Syed Sahib (RA) in Kamptee. A businessman was rushing towards the court, and he looked worried as a case was registered against him. When Baba Taj al-Din (RA) saw him, he laughed and said, "The case has been withdrawn."

The businessman thought to go and verify this in court and found that it was indeed true. He brought sweets for Baba Sahib (RA) who said, "Why give these sweets to me? Distribute it among the children."

One day, some followers of Baba Sahib (RA) were talking at a distance from Baba Taj al-Din's (RA) residence. One of them said, "I am better than all of you as I have left all of my property to serve Baba Sahib."

The other said, "My sacrifice is not less than yours. I abandoned my shop to come here."

In short, they were all trying to look better than the other. During the discussion, Baba Sahib (RA) came out of the residence and read the following verse from the Holy Quran to them,

"They make it favour unto thee that they have surrendered (unto Him). Say: Deem not your Surrender a favour unto me; nay, but God doth confer a favour on you, inasmuch as He hath led you to the Faith, if ye are earnest." (Quran, 49:17)

Once, the Lady of Bhopal arranged a lavish meal and while getting the food ready, she said, "Who else would feed Baba Sahib (RA) such a meal?" When it was

Baba Taj al-Din (RA) was once travelling to Dighori. During the journey, a man named Abdullah Dakhani was travelling with him, and he was responsible for ensuring that everyone was provided with water whenever Baba Nagpuri (RA) would travel to Dighori. To fulfil his duty, Abdullah Dakhani travelled with a pot of water. He offered water to Baba Nagpuri (RA) but Baba Sahib (RA) refused it and said, "Give water to the horse first, Then I will drink it."

There was a horse nearby. When Abdullah Dakhani offered it water, it was so thirsty that it drank five buckets by itself.

The crops were once greatly damaged during a severe drought which in turn had the effect of the death of many cattle too. People went to Baba Nagpuri (RA) and said, "Baba Jee ! Food has become expensive and due to the lack of rain, the people are in great trouble."

Hazrat Baba Taj al-Din (RA) smiled and walked towards the jungle where he reached a village. The farmers there said, "The crops are destroyed from the drought and the cattle are dying."

Baba Taj al-Din's (RA) state changed as he heard this, and in great passion, he asked for water. He then lit a fire after gathering some wood and began to pour the water brought to him slowly upon it. As soon as the water droplets fell into the fire, they evaporated and moved to the sky as steam.

After a short while, people saw that the sky was becoming cloudy. As the water in the pot had been fully evaporated, the sky was fully covered with clouds, and shortly after, it rained heavily.

There is immense wisdom in this account for the student of *tasawwuf* (spirituality). Please contemplate and share your understanding as to what you have gathered from it. What principles are hidden in this wonder working? How did the sky become covered with clouds when droplets of water fell on to the burning wood?

Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) put a lot of emphasis on two points: One's connection with God, and the sincerity in their actions. He used to say, "You will remain good if you recite the name of God."

Connection with God is the soul of the religion. Prayers and remembering God are such activities that lead to God. A person remains happy and peaceful while they are attentive towards Him. But diversion of their attention towards other things causes distractions as one indulges in abundance. This results in mental, psychological and physical ailments.

A usurer once came to Baba Nagpuri (RA) in Waki. Baba Sahib (RA) struck him with a stick and said, "You are so cruel that you trouble people. Stop taking interest payments." This event had such a grave impact on the man's

(RA) stood up and went to him, touched his face thrice with the index finger and said, "Hazrat! This court is a place for prayer!"

When Khwaja Ali Ameer al-Din (RA) heard this, he became static and immediately returned to where he was sitting. After that day, Khwaja Ali Ameer (RA) became mild and kind.

The wonder workings from Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) are a source of great wisdom. They contain principles and directions as to how one should educate their mind and spend their life. Please read them and evaluate your lives in its perspective.

A boy was disabled since birth. He could neither talk, nor move his hands or legs. His parents tried all sorts of treatments that they could afford but nothing worked. One day, they left the boy in Shakardara at Baba Taj al-Din Nagpuri's (RA) place.

After a short while, Baba Taj al-Din (RA) came out and saw the boy. He went to him and asked some people to bring food. They hurried to get it. For nearly half an hour after, he fed the boy little morsels with his own hands, and gave him water. He then appointed someone to take care of the boy. Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri's (RA) kind actions bore such results that those who would come to visit him, would find it an honour to also serve the boy. For the rest of his life, the boy faced no troubles.

One day, Baba Taj al-Din (RA) was passing through the town of Patansaongi accompanied by hundreds of people. It was routine that a huge number of people would run along his carriage as he travelled. At some point, Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) noticed an old couple in a broken house. They were having trouble grinding flour due to their frail age. Baba Sahib (RA) got down from his carriage and went to help them. He grinded all of the barley in a short amount of time, handed it over to the couple and went back to his carriage to leave.

Baba Taj al-Din's (RA) entire life is an example of kindness and love for the creations of God as he devoted himself to serve people. One night, when food was served to him, he said, "I will eat after my guest staying under the tree eats first." His followers looked about in various places but could not find the guest that Baba Jee (RA) spoke of.

Baba Sahib (RA) once again had food put before him, but his answer was the same, "Feed the guest first." So once more, his followers began to search for this guest and finally found someone sitting under a tree. When they asked the man where he had come from, he said that he was a very poor man and had come to visit Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) from a far place. They presented him with food and let him know that it was sent from Baba Sahib (RA).

An Ocean of Knowledge

Baba Nagpuri (RA) spiritually explained to him that abstinence does not mean to abandon the world. Rather, it means to get rid of those thoughts that hinder one's progress in the path of God.

In each era, God sends people to the world who are trustees of His secrets, and become a medium to introduce people to the works of God. As per the holy Quran, these friends of God are the vicegerents on Earth – heirs to the knowledge of prophets and have authority over the universe.

To have an authority means to have control over the universe with the will of God. The friends of God are pious people whose minds directly see and understand the underlying factors behind the workings of the universe, and look for God's signs in His every manifestation. One of such reverent personalities is Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA), who is also known by the titles of Shahenshah Haft Iqleem (Emperor of Seven Realms) and Taj al-Millat (Crown of the Ummah).

Baba Taj al-Din Nagpuri's (RA) life is a profound chapter in itself. One can only try to understand it through the information that we have about him. We can only make efforts to have an extensive view of his teachings; to know the lives of friends of God, it is imperative that one follows in their footsteps.

Acting upon their advice lifts the veils on the mind one by one, and those who follow, have their minds synchronised with the waves of the person who gave them the command. When this happens, one mind becomes subservient, and the other dominant. In other words, the magnet overpowers the iron and dominates over it.

Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) is an ocean of knowledge. By diving into it, one becomes aware of the reality and truth of life.

To serve the creations of God selflessly is a quality of God's friends as they possess a mind that see things without distinctions. One may devote days and nights and whatever they have for the welfare of people, but such passion of sacrifice cannot exist without feelings of love.

The life and personality of Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) is replete with knowledge, love, service and sacrifice. His words contain deep meaning and knowledge that unveils the unseen phenomenon.

A disciple, Khwaja Ali Ameer al-Din (RA), once came to Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri (RA) in state of deep immersion and said, "Shall I turn this palace upside down?" He repeated these words twice.

Hazrat Baba Taj al-Din Nagpuri

called. Water is the same everywhere.

- "God is the *Noor* of the heavens and the earth." (Quran, 24:35)
- "Then was not non-existent nor existent: there was no realm of air, no sky beyond it. What covered in, and where? and what gave shelter? Was water there, unfathomed depth of water?"

(Rig Veda, 10:129)

- "God said, let there be light and there was light." (Genesis, 1:3)
- "In the beginning was the Word, and the Word was with God and the Word was God." (John, 1:1)

Noor, light, water, word – all are stages of information.

Question: *Noor* descends from *Loh e Mahfooz* (Preserved Tablet) and scatters into the universe. When the information and the source of information is the same, why does everyone interpret it in their own way?

Answer: Information is also termed as inspiration. When an individual does not accept inspiration in its original form, it is distorted and marred by their own perception. The factors that create division among people and keep them at bay from reality include partial thinking and the act of considering illusion as reality. We all receive information, but some of us sieve it through the filter of hatred whereas others become the epitome of love.

With respect to our relation with our Great Father and Mother, Adam and Eve (PBUT), we are brothers and sisters to one another, irrespective of the regions we live in. Difference in languages, race and colour are due to varied climatic conditions of the regions people are situated in. But despite these differences, our family tree is the same. We are one family, but when conforming to a restricted pattern of thinking, we consider each other as separate.

On Adam's Day, people and religious scholars from all backgrounds come together to promote interfaith harmony and contemplate the shared values of Adam and Eve (PBUT). Doing this not only makes the differences between us insignificant, but it creates an environment of unity in our diversity, helping this world become an abode of peace.

Those who contemplate the Divine Books, and the last book (the Holy Quran), hold the rope of God, and are protected from illusions (division). If mankind understands the system of information, they can certainly come together on a single platform.

and objects traverse to and fro within them.

When a viewer is engrossed in watching a movie that is otherwise called a collection of waves, the depth in the dimensions of waves make them feel as though the objects are tangible. That is why they consider it real and laugh and cry while watching it.

The question is then, that when everything is images and images are static, why do they appear to be in motion on the screen?

While watching a film, we see characters in motion, whereas in reality, they are merely static images. A film is a sequence of images that gives the illusion of continuous movement. This movement is hypothetical and we deem it to be the movement of the characters in the movie. However, the fact is that the movement is of the belt on which the reel is moving rapidly.

The number of frames per second is varied as per technology. Let us suppose there are 24 frames per second; these 24 still images will produce the movement of one second. Now compare this example with your own life and think about the reality of it.

The Universe is a recorded film. Everything that came into form with the command of *Kun,* is now being manifested through information in every realm. It is the information that unfolds the dimensions, and at the same time, it has the ability to fold these dimensions into a dot. As the Almighty God says,

"O mankind! Be careful of your duty to your Lord Who created you from a single soul and from it created its mate and from them twain hath spread abroad a multitude of men and women."

(Quran, 4:1)

The Universe was created with love and affection so that creatures could attain the cognition of God. Every messenger and prophet preached to their followers that God is One, He is incomparable, and therefore, they should worship Him to become a true believer.

From Prophet Adam (PBUH) to Prophet Noah (PBUH), and then on to the last messenger, Muhammad (PBUH) – all of them made it obvious to their followers that their teachings were the same and in continuance of the messages from their brothers who were sent to guide mankind before them.

God is One, and His message is the same, but the time and era in which the messengers preached was different. That is why their teachings are in different languages according to their times, but the message given to them was always the same. A change in language does not alter the meaning of words. When one feels thirsty, they think of water. There are different words for water used in different languages, but this does not change the nature of water itself, regardless of what it is

you are our Lord."

Information descends in a form of sound and this sound is uniform. It is perceived as per the consciousness of individuals and is divided into the faculties of hearing, seeing, comprehending, speaking, feeling, etc. The process of the expansion and contraction of information in a dot can be explained through the example of a projector.

When a beam of light emits from a projector and passes through a reel of film, it captures images from the reel and scatters them onto the cinema screen. The light emitting out of the projector is the same but it holds different proportions within it. If we look carefully at the aperture through which light spreads onto the screen, we can observe distinct rays in various directions. Rays are actually wavelengths and wavelengths are images. When rays spread onto the screen, the images within them become obvious and apparent.

Information is knowledge and knowledge descends in stages.

- Perception is the first stage in the comprehension of information.
- When perception deepens, it becomes sight.
- A subtle shadow reflects on the mind, and the image concealed within begins to surface.
- As the image takes up a form, it begins to speak, hear, see and move.
- Seeing through the waves is tantamount to feeling an image.
- The act of seeing and feeling an image is consciousness.
- The core of the consciousness are waves.

A person feels the urge to eat wheat. Paying attention to this urge is the act of perceiving. When one homes in on this information, the sound (thought) 'wheat' appears in their memory, but the image of it does not surface immediately. This is the realm of sight that is latent at this stage, where although the image of wheat is stored in their minds, the person cannot see it yet. When thoughts deepen even further, a subtle shadow of wheat is reflected on the mind's screen.

Muse over this point. It is neither wheat nor its shadow, but the reflection of the shadow! Gradually the colours become vivid and their density gives an impression that the object is tangible. However, the image of wheat does not ever leave our mind; it is its reflection that we consider to be 'outside'. This is the consciousness of an individual.

An individual, like wheat, is also an information based on waves. In other words, waves are objects and objects are in different wavelengths. It is the waves that discern each other through waves,

Auliya Allah (the friends of God), who continue disseminating messages of peace and unity.

To unite people on a common platform by promoting interfaith harmony, a friend of God took the initiative to hold a celebration called Adam's Day on August 10th, 2003. He is known for his decades-long efforts to promote the understanding of spiritual knowledge and a life style marked by inner peace. His efforts were widely appreciated, and now, Adam's Day is celebrated every year in USA, UK, Canada, Russia and many other countries under the supervision of the 'Qalandar Shaoor Foundation'.

This year, the theme of Adam's Day is 'Dimensions in a Dot', or put in another way, information and its stages. Let us understand how mankind can acquaint themselves with the mechanism of information, so that they may unite on a single platform.

Making assumptions and being untouched by reality produces superficial thoughts. A person in such a state believes that the expansion of the world is equal to the scope of their vision, but those who contemplate know that beyond the world of colours, there are innumerable worlds where dimensions hold a secondary place.

Everything has a background. Though things carry colours on a surface level, behind the surface colours is light from *Noor* (one of the stages of Divine light). *Noor* is the foundation of this universe, where dimensions lie latent in a dot. And from this dot, space begins to expand and forms into a Universe.

What is the expansion and contraction of a dot? The process of expansion brings forth colours to create distinction, whereas the process of contraction subdues them and enhances the foundation of the beings. This mechanism of expansion and contraction works on information.

Information is the guiding factor to explore this Universe. So, what is information?

"Ponder in your mind – you will find nothing but images there. Those images hear, see, talk, understand and also have an ability to look within. But is it the images in your mind that are causing those movements? Who is it that keeps them in motion?"

This Universe is a reflection of the 'Will of God'. The reflection is invigorated by the soul and the soul is under the command of God. One of the faculties of the soul is expressed through information. In the beginning, the creatures were unaware of their existence until God asked, "Am I not your Lord?" The voice of God awakened the aural faculty first, followed by the activation of sight, comprehension, feeling and speech respectively. The creatures submitted to God and said, "Yes,

Dimensions in a Dot

On Adam's Day, people and religious scholars from all backgrounds come together to promote interfaith harmony and contemplate the shared values of Adam and Eve (PBUT).

We all are the descendants of Prophet Adam and mother Eve (PBUT). We can trace our origins all the way back to them as the first human couple on Earth. However, instead of relating to each other as their children, we keep ourselves limited to our immediate relations. This restrictive thought process has divided mankind.

For every nation, there was a messenger who taught them the difference between good and evil. The prophets preached the Oneness of God, and stressed that only He is deserving of worship. The messengers told us that God wishes to see brotherhood among his creatures; He wants them to be happy, and dislikes unhappiness. Every messenger made it clear to their nations that their message was a continuation of what was taught to prior nations by their predecessors.

Almighty God conveyed the message to His beloved messenger, Muhammad (PBUH),

"Naught is said unto thee save what was said unto the messengers before thee." (Quran, 41:43)

The Bible says,

"The Lord thy God will raise up unto thee a Prophet from the midst of thee, of thy brethren, like unto me; unto him ye shall hearken." (Deuteronomy, 18:15)

The Creator of the Universe is one, and His message is the same for all. The resources to disseminate His message are the same too, and so is the information about the resources and the source of movement in everyone's body. All people of faith believe in the messengers, but despite this, the believers are not united.

The reason for this division is our lack of understanding of the Divine books. It is because the teachings of the messengers have been abandoned and in the pursuance of personal interests, differences have arisen.

The world is passing through an age that is marked by divisions, differences and a lack of unity. Today, the children of Adam and Eve (PBUT) harbour great animosity towards each other. Peace is not possible at this stage unless we connect to our roots and remember that we are Adam and Eve's (PBUT) children, and work towards accessing our heritage, which is the knowledge of the formulae of all creations.

In every era, there have been people who have introduced the masses to peace and tranquility and invited them to the path of God. This continued with the heirs of the prophets, or the

V

The admirer of Prophet Muhammad (PBUH) – Allama Iqbal (RA) says,

Translation:

The eye of the seed lies awake deep beneath the earth,
Anxious to bloom and mature.

A spark of life encased deep within the seed,
Is coerced to birth through the crust for fulfillment.

The cold grave has failed to dishearten it,
Neither has its burial succeeded in draining its passion.

Rising over its tomb, it has blossomed into a flower,
Borrowing attires of life from death.

The grave merges and uplifts the distrait energies,
Casting a noose around the neck of the skies.

Death becomes the renewed flare of life,
While the veil of sleep, brings in the message of awakening.

• • ——————————— • •

Death and sleep are merely clothing – there is life on their edges. The entity within the clothing is the same but its apparel continues to alter and we name it childhood, adolescence, youth, and old age. During this passage, one also adorns the clothing of relationships as their role and responsibilities vary due to a change in their surroundings i.e. being decision makers in homes, being an employee in an office, or a citizen of a country.

Law: All creatures are bound to live in a certain clothing that differs according to their proportions and characteristics. However, among these proportions, both the best and the lowest are associated to mankind i.e. *Ahsan-e-Taqweem*, and *Asfala Safileen* respectively.

> "Surely We created man of the best stature. Then We reduced him to the lowest of the low." (Quran, 95:4-5)

May God protect you.

---

* Readers are invited to express their views regarding this article. Thank you.

The Almighty God breathed soul in an effigy of clay, and displayed movement through it.

> "And when thy Lord said unto the angels: Lo! I am creating a mortal out of potter's clay of black mud altered. So, when I have made him and have breathed into him of My spirit, do ye fall down, prostrating yourselves unto him." (Quran, 15:28-29)

A machine without electricity is merely a structure made of iron, just like a dead body devoid of energy. As people turn into particles of dust without a soul, in the same manner, a machine with no energy rusts, meeting the same fate.

The soul is distinguished through different stages in the material world. These stages reflect the phases of one's understanding. It needs thorough contemplation that life is one, and that movement in it is singular as well. But to make it easier to understand, we have classified life in stages.

An illusory mind sees that the day and night alter, and this alteration turns today into tomorrow and tomorrow into the day after and so forth. But in actuality, the day and night do not undergo alterations. On the contrary, a person free of illusory senses – who does not see alteration in objects – distinguishes the celestial entities and everything else in their true facet.

Example: The size of a human sperm is said to be 0.002 inches. When one is acquainted with the hidden reality, they can see a six-foot-tall person in the sperm. It makes one wonder if the stages of material growth have any significance at all?

• • ——————————— • •

Movement is reflected through a medium called senses. Senses are fragmented in the state of wakefulness, but they remain fixed on one point in the mode of sleep. The material body attains dominance when senses are disintegrated, whereas the realm of sleep defies such fragmentation. We do not hear and see through the ears and eyes, nor does our nose smell or mind and tongue understand and speak. The sense of hearing, sight, feeling, understanding or that of speech etc. is one. Had they been in multitude, a conflict would have risen among them.

The body is just a medium, but by regarding it as the prime entity, one gives foremost importance to its features. If the physical eye is responsible for enabling sight, then who is it that sees in our imagination?

The division in senses is an illusion and this is what creates a distinction between the state of sleep and wakefulness.

that spends life in the state of sleep, and what is the standing of the body?

The person in the realm of sleep is someone else, but at the same time one must also consider that the material body does not travel to that realm and remains on the bed. If the physical body is responsible for movement, then who is it that spends life in the other zone? It is said that, ''I, during sleep, saw myself roaming around in different places, wearing elegant clothes, eating delicious food and in the company of revered people.''

Please go through the above sentence again and answer who it was that travelled around, had food, and who is the 'I' that witnessed all of these events and actions? In the dream state, the one whom we refer to as 'I', in actuality is the observer, the observation, and also the one who is being observed.

• • ——————————— • •

Life is one of the secrets of the universe where the reality of everything can be understood through its opposite facet. The state of death, like the state of sleep informs us that movement is not ascribed to a body. It is caused by the One who instills life in the effigy (body). When the source of movement is not the physical body then why do we consider the body dead, only after one's death?

The body is merely a medium to exhibit movement. Movement is an 'entity' that is present in every zone, as there is no alteration or disruption in the laws of God. When movement transfers into another zone, the body of *Nasoot* (the material world) becomes immobile, and when it returns to the material realm, it goes to sleep in the realm it has come from. Sleeping is to be oblivious of one's presence despite their existence. Then what is the basis of feeling one's presence and who prompts this feeling?

A medium is a cover to reflect the presence of the being who cannot be perceived through the physical eye. Every realm has a particular medium but the movement in all of them is uniform. To enlighten one's self with the basis of movement, one needs to be cognisant of all the mediums in each realm.

Every medium reflects the characteristics of their respective zone. In *Nasoot*, it is composed of clay, and in the realm of *Nasma*, it is made of *Hayula* (prime material), and prior to *Hayula* are the realms of *Roshni, Noor,* and *Tajalli* – all of these are stages of light and mediums to manifest life in their zones. However, life in itself is a medium to display movement. But what is movement and to whom does it belong?

• • ——————————— • •

* Have you ever paid attention to what the doll is?

* What is the key analogous to?

* What is movement?

* And who is it that winds the key?

* Does the toy (man – *aadmi*) hold any significance without the key and the entity who winds it?

• • ——————————— • •

One of the elements in the making of a body is sounding clay. It is an attribute that indicates the presence of a void in a body. Void refers to a space that contains forms and features, and features are triggered by movement. One must observe that features do not function by themselves, it is the movement 'in' them that keeps them dynamic. 'In' is the inner of a person. What we see outside is the manifestation of movement, which is present inside.

An individual who lacks knowledge of the reality attributes 'movement' to forms and features. However, after successive alterations, forms and features disappear, but the movement remains.

When a person is attentive towards the features, they are unable to see the void. Nevertheless, if they were to concentrate on the void, the features would go into the background. If you look at the space between the sky and earth, you will see a void but not the lives inhabiting it. This void, however, has innumerable worlds within it, and is the abode for jinn, the air and other creatures that are foreign to us and cannot be seen even through a microscope.

We look at things at the surface level, yet are oblivious of their foundation (void). Since everything is made out of definite proportions, the best of all proportions is *Ahsan-e-Taqweem* (the best of statures), which formulates an *Insan* (human). But despite possessing this highest stature among the creatures, mankind has harmonised itself with proportions lower than their stature. That is why, they see the façade and not the void.

• • ——————————— • •

Clothes are worn to cover a body. When the sleeves of a shirt move due to the movement of the hands, nobody declares the movement to come from the sleeves, as they are certain that it is the hand that moves them. However, we do not perceive the body and movement in the same context. The sight observes movement through the body, and concludes it to be the movement of the body. When we are dead or asleep, the body appears to be immovable, but it does not occur to us that we see ourselves fulfilling the needs of life in the state of sleep. Who is it then

Message of the Day

Day and night are two modes of life. The day is where one performs their daily affairs whereas the night is for rest, but this fact does not apply to all creatures. As the timings for day and night vary between the creations, what we deem as day is not really 'day' and what we consider night, is not the 'night'.

Night and day are two ways of observing the same senses, and are associated with the state of sleep and wakefulness respectively. When a person sleeps and then wakes up in the other realm, they do not remember that they are sleeping in the material world. This is because, even in the state of sleep, the needs of life remain intact and uninterrupted – individuals walk, talk, think, experience sadness and happiness, and also witness the superior realms i.e. dreams within dreams.

What is it that we refer to as sleep, and what does it mean to see one's self in motion in that realm? This should be reflected upon.

A person does not push aside the realities of sleep when they wake up in the material world, because the impressions of what they went through during their sleep leaves marks in their memory, and the person feels them in the material world as per the intensity of the marks.

When one sleeps in this material world, and wakes up in the other realm, they accept that phase of life with all certainty, and forget the realm where their physical body lies. This propels us to think that when one is awake despite being in the zone of sleep, then what is sleeping, and who is it that remains awake here, and there?

• • ——————————— • •

Life is a combination of the body and soul. The body is clothing, while the soul stirs movement within it. A body is synonymous to a toy, which does not move on its own, and lives on energy to stimulate movement in it. For example, a windup doll moves once energy is generated by rotating a winder. The doll then walks, talks, smiles and after consuming all of the stored energy, comes to a standstill. Is the position of a doll, without the winding key, anything but a corpse?

The following points elaborate on this further.

1. Doll
2. Key
3. Winding (movement)
4. The one who winds the key

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
Dimensions in a Dot	From the Desk	167
An Ocean of Knowledge	Sohail Ahmed	162
The Enchanting Plant Kingdom	Bibi Anuradha (UAE)	155
Prophet Jesus (PBUH)	Extracted	150
The Universe is Light	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	147

"Our heart is the thousand stringed instrument. Our sadness and fear come from being out of tune with love."

– Hazrat Hafiz Shirazi (RA)

Vol 7 Issue 7 | August 2019 | Dhul Qadah
Dhul Hijjah — 1440AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya RA

Chief Editor
Khwaja Shams al-Din Azeemi

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.70/- Per issue. Annual subscription Rs.950/- with Reg. Post (Domestic), US$ 60/- (International)

**Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town
Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020**